الرسالہ

Al-Risāla

June 2000 • No. 283 • Rs. 10

جب آپ کھوئی ہوئی چیز کا غم نہ کریں تو
آپ نے ثابت کیا کہ آپ کھوئی جانے والی
چیز سے زیادہ بلند تھے۔

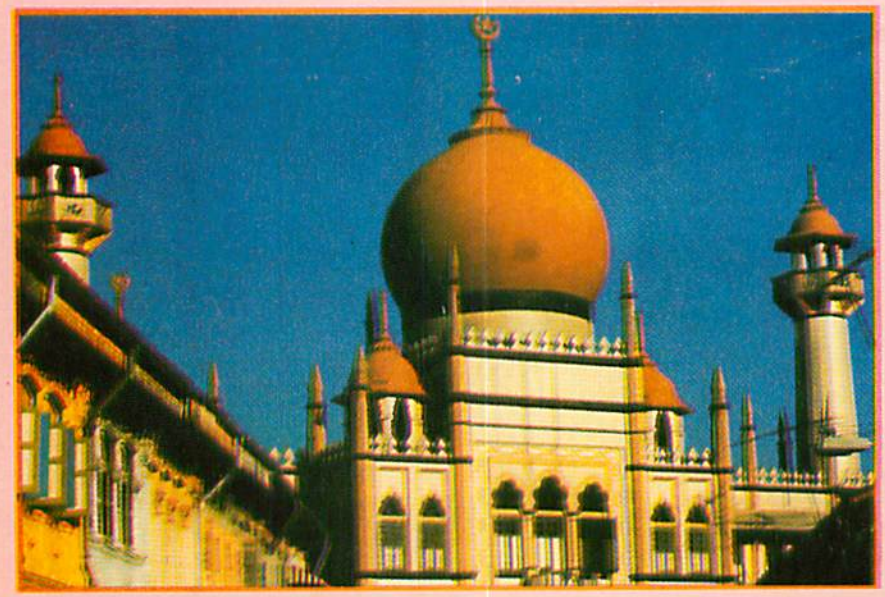

The Sultan Mosque, Singapore

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر، مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

تذکیر القرآن (مکمل)	400.00
اسلام: ایک تعارف	80.00
اللہ اکبر	45.00
پیغمبر انقلاب	50.00
مذہب اور جدید چیلنج	55.00
عظمت قرآن	35.00
عظمت اسلام	50.00
عظمت صحابہ	7.00
دین کامل	60.00
الاسلام	45.00
ظہور اسلام	50.00
اسلامی زندگی	40.00
احیاء اسلام	35.00
راز حیات	65.00
صراط مستقیم	40.00
خاتون اسلام	60.00
سوشلزم اور اسلام	50.00
اسلام اور عصر حاضر	30.00
الربانیہ	40.00
کاروان ملت	45.00
حقیقت حج	30.00
اسلامی تعلیمات	35.00
اسلام دور جدید کا خالق	25.00
حدیث رسول	40.00
سفر نامہ (غیر ملکی اسفار)	85.00
راہ عمل	25.00
تعبیر کی غلطی	80.00
دین کی سیاسی تعبیر	20.00
عظمت مومن	7.00
اسلام ایک عظیم جدوجہد	5.00
تاریخ دعوت حق	5.00

مطالعہ سیرت (کتابچہ)	12.00
ڈائری (جلد اول)	80.00
کتاب زندگی	65.00
اقوال حکمت	25.00
تعمیر کی طرف	8.00
تبلیغی تحریک	20.00
تجدید دین	25.00
عقلیات اسلام	35.00
قرآن کا مطلوب انسان	8.00
دین کیا ہے؟	7.00
اسلام دین فطرت	7.00
تعمیر ملت	7.00
تاریخ کا سبق	7.00
فسادات کا مسئلہ	5.00
انسان اپنے آپ کو پہچان	5.00
تعارف اسلام	5.00
اسلام پندرہویں صدی میں	5.00
راہیں بند نہیں	12.00
ایمانی طاقت	7.00
اتحاد ملت	7.00
سبق آموز واقعات	7.00
زلزلہ قیامت	10.00
حقیقت کی تلاش	8.00
پیغمبر اسلام	5.00
آخری سفر	7.00
اسلامی دعوت	7.00
حل یہاں ہے	10.00
سچا راستہ	8.00
دینی تعلیم	7.00
امہات المومنین	20.00
تصویر ملت	85.00

دعوت اسلام	50.00
دعوت حق	40.00
نشری تقریریں	80.00
دین انسانیت	60.00
فکر اسلامی	50.00
شتم رسول کا مسئلہ	50.00
طلاق اسلام میں	5.00
مضامین اسلام	60.00
حیات طیبہ	7.00
باغ جنت	7.00
نار جہنم	7.00
خلیج ڈائری	10.00
رہنمائے حیات	7.00
تعدد ازواج	7.00
ہندستانی مسلمان	50.00
روشن مستقبل	7.00
صوم رمضان	7.00
اسلام کا تعارف	4.00
علما اور دور جدید	8.00
سفر نامہ اسپین و فلسطین	60.00
مارکسزم: تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	12.00
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	8.00
یکساں سول کوڈ	5.00
اسلام کیا ہے؟	8.00
میوات کا سفر	35.00
قیادت نامہ	35.00
مطالعۂ سیرت	60.00
منزل کی طرف	4.00
اسباق تاریخ	85.00

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ، جون، 2000

فہرست

ذکرِ خداوندی ---------------- 4
دریا عمل ---------------- 5
قولِ خیر ---------------- 6
عالم کون ---------------- 7
شریف، کمینہ ---------------- 8
محرومی پر راضی ہونا ---------------- 9
سکون مطلوب نہیں ---------------- 10
زیادہ بڑی گود ---------------- 11
قدرتی ڈھال ---------------- 12
سچائی کی طاقت ---------------- 13
مسلسل کوشش ---------------- 14
تخلیقی منصوبہ ---------------- 17
ایمان ایک معرفت ---------------- 19
فطری حل ---------------- 21
مطالعۂ قرآن ---------------- 24
ایک خط ---------------- 39
سوال وجواب ---------------- 41
خبرنامہ اسلامی مرکز ۱۴۶ ---------------- 47
ایجنسی الرسالہ ---------------- 50

الرسالہ

Al-Risāla

اردو، اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیرسرپرستی

مولانا وحیدالدین خاں

صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla
1, Nizamuddin West Market,
New Delhi-110013
Tel. 462 5454, 461 1128
Fax 469 7333, 464 7980
e-mail: skhan@ vsnl.com
website: www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 10
One year Rs. 110. Two years Rs. 200
Three years Rs. 300. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY
AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel./Fax 718-2583435
e-mail: kaleem@alrisala.org

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi.
Printed at Nice Printing Press, 7/10, Parwana Road, Khureji Khas, Delhi- 110 059.

ذکرِ خداوندی

انسان کی کامیابی کیا ہے۔ انسان کی کامیابی یہ ہے کہ اس کو خدا کی قربت نصیب ہو۔ دنیا میں یہ قربت "ذکر" کی صورت میں حاصل ہوتی ہے اور آخرت میں یہ قربت "جنت" کی صورت میں خدا کے ذاکر بندوں کو ملے گی۔

ذکر دراصل خدا سے حیاتی قربت کا دوسرا نام ہے۔ آدمی کے شعور اور احساس پر جب خدا کا تصور غالب آتا ہے تو اس کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ اس کے دل پر خدا کا خیال چھایا رہتا ہے۔ ہر تجربہ اور مشاہدہ میں اس کو خدا کا جمال و کمال دکھائی دیتا ہے۔ اسی یاد خداوندی کا نام ذکر ہے۔

جب آدمی پر یاد کی یہ کیفیت غالب آتی ہے تو اس وقت اس کی زبان سے تسبیح و تحمید کے کلمات نکلنے لگتے ہیں۔ یہ کلمات رٹے ہوئے الفاظ نہیں ہوتے۔ رٹے ہوئے الفاظ کی تکرار کو "ذکر" کہنا ذکر کی تصغیر ہے۔ ذکر اس سے زیادہ لطیف حقیقت ہے کہ وہ رٹے ہوئے الفاظ کی تکرار میں سما سکے۔ ذکر دراصل اپنے آپ کو اللہ میں گم کر دینے کی ایک حالت ہے، یہ بندہ اور خدا کا وہ آخری ملاپ ہے جو موجودہ دنیا میں کسی انسان کے لئے ممکن ہوتا ہے۔

جنت خدا کی نعمتوں کا ابدی باغ ہے۔ یہاں خدا کی نعمتیں اپنی آخری اور معیاری صورت میں ظاہر ہوں گی۔ یہ جنت انہیں لوگوں کا حصہ ہے جن کو اللہ کے سچے ذکر کی توفیق حاصل ہوئی۔

ذکر خدا کی معرفت میں جینے کا نام ہے۔ اور خدا کی معرفت میں جینے سے زیادہ عظیم کوئی زندگی موجودہ دنیا میں ممکن نہیں۔ یہ ذکر کسی آدمی کو کس طرح حاصل ہوتا ہے۔ اس کا ذریعہ قرآن میں غور و فکر بتایا گیا ہے۔ جب ایک انسان کے اندر ربانی شعور بیدار ہو جاتا ہے تو وہ ہر چیز کو خدائی زاویہ سے دیکھنے لگتا ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کی پوری کائنات میں خدا کے جلووں کا مشاہدہ کرتا ہے۔ ہر چیز اس کے لئے خدا کا تعارف بن جاتی ہے۔ ان لطیف تجربات کے دوران اس کی زبان سے جو کلمات حمد نکلتے ہیں انھیں کا نام قرآنی اصطلاح میں ذکر ہے۔

دیرپا عمل

ایک روایت الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ صحیح البخاری (کتاب الرقاق، باب القصد والمداومة علی العمل) کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: ان احب الاعمال الی اللہ ادومها و إن قلّ (اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ عمل وہ ہے جو دیرپا ہو، اگرچہ وہ کم ہو) فتح الباری ۱۱/۳۰۰

اس قول رسول کا ایک تعلق عبادات سے ہے۔ مثلاً نفل نماز یا نفل روزہ میں آدمی کو ایسی مقدار کو اپنا معمول بنانا چاہئے جس کو وہ ہمیشہ جاری رکھ سکتا ہو۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ تھوڑے دن تو بہت زیادہ نوافل کا اہتمام کرے اور اس کے بعد وہ کم پر بھی قائم نہ رہے۔

یہ ایک مستقل اصول حیات ہے۔ اور اس کا تعلق زندگی کے ہر پہلو سے ہے، دوسرے لفظوں میں، اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کام بھی شروع کرو اس کو ایسی صورت میں شروع کرو جو برابر جاری رہنے والی (sustainable) ہو۔ یہ منصوبہ بند عمل کا اہم ترین اصول ہے۔ اس دنیا میں ہر بڑا نتیجہ منصوبہ بند عمل کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ اور نتیجہ خیز منصوبہ وہی ہے جو شروع کرنے کے بعد دیر تک جاری رہ سکے۔

اس دنیا میں کسی عمل کا نتیجہ ہمیشہ دیر میں نکلتا ہے۔ تھوڑے وقت میں کوئی بڑا نتیجہ پالینا موجودہ دنیا کے نظام میں سرے سے ممکن ہی نہیں۔ ایسی حالت میں نتیجہ خیز عمل وہی ہو سکتا ہے جو دیرپا عمل ہو۔ جو عمل دیر تک جاری نہ رہے اس کے متعلق پیشگی طور پر جان لینا چاہئے کہ وہ اس دنیا میں بے نتیجہ ہو کر رہ جائے گا۔

آدمی کو چاہئے کہ وہ جو کام شروع کرے اس کو مستقل مزاجی کے ساتھ مسلسل جاری رکھے۔ اور جس عمل کو مسلسل جاری رکھنا اس کے لئے ممکن نہ ہو اس کو وہ شروع ہی نہ کرے۔ کیوں کہ ایسے آغاز کا کوئی انجام اس دنیا میں ہرگز نکلنے والا نہیں۔

قولِ خیر

روایات میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہئے کہ وہ بہتر بات بولے ورنہ چپ رہے۔ من کان یؤمن باللہ والیوم الاخر فلیقل خیرا او لیصمت (فتح الباری ۱۰/۴۶۰)

ابن حجر العسقلانی نے اس کی شرح کے تحت لکھا ہے کہ یہ حدیث جوامع الکلم میں سے ہے۔ کیونکہ وہ خیر و شر کے تمام پہلوؤں کے بارہ میں نہایت جامع رہنمائی دے رہی ہے (صفحہ ۴۶۱) اس حدیث رسول پر گہرائی کے ساتھ غور کیجئے تو اس سے کلام کے تین درجے معلوم ہوتے ہیں۔

۱۔ معاملہ کے صرف مثبت پہلو کو بیان کیا جائے تاکہ لوگوں کو حوصلہ ملے۔

۲۔ منفی پہلو کا ذکر ہو تو اسی کے ساتھ مثبت پہلو کی نشان دہی بھی ضرور کی جائے۔

۳۔ جس آدمی کے پاس کہنے کے لئے صرف منفی پہلو ہو اس کو خاموشی اختیار کرنا چاہئے۔

اللہ پر ایمان آدمی سے کبر کا جذبہ چھین لیتا ہے۔ وہ سراپا تواضع میں ڈھل جاتا ہے۔ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ خدا ہی سب کچھ ہے اس کے مقابلہ میں میری کچھ حیثیت نہیں۔ اس طرح آخرت پر ایمان اس کے اندر محاسبۂ خویش کا بے پناہ جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔ وہ موت سے پہلے خود ہی اپنے قول و عمل کی نگرانی کرنے لگتا ہے تاکہ وہ موت کے بعد کی سخت تر پکڑ سے بچ سکے۔

اللہ اور آخرت پر ایمان آدمی کو آخری حد تک سنجیدہ بنا دیتا ہے۔ اور جو اپنی فکر میں پوری طرح سنجیدہ ہو جائے تو وہ بولے گا تو درست بات بولے گا ورنہ خاموش رہے گا۔

جس طرح بولنا ایک کام ہے اسی طرح چپ رہنا بھی ایک کام ہے۔ قول اگر ایک عمل ہے تو خاموشی بھی اسی طرح یکساں درجہ کا ایک عمل ہے۔ سچا انسان وہ ہے جو یہ جانے کہ کب بولنا ہے اور وہ کون سا موقع ہے جب کہ اس کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی زبان بند کر لے۔ جو آدمی اس فرق کو نہ جانے وہ یا تو غیر سنجیدہ ہے یا غیر دانش مند۔

عالم کون

فارسی کا ایک قطعہ ہے کہ ـــــ وہ شخص جو نہیں جانتا مگر جانتا ہے کہ وہ جانتا ہے وہ ہمیشہ جہل مرکب میں مبتلا رہتا ہے۔ اور جو شخص جانتا ہے مگر جانتا ہے کہ وہ نہیں جانتا وہ ایک لنگڑا گدھا ہے جو منزل پر پہنچ جائے گا:

آن کس کہ نداند و بداند کہ بداند　　در جہل مرکب ابد الدھر بماند
و آں کس کہ بداند و بداند کہ نہ داند　　او نیز خر لنگ بہ منزل برساند

عالم ہونے کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ آدمی کو اپنی بے علمی کا احساس ہونے لگے۔ علم یا معلومات کا دائرہ اتنا زیادہ وسیع ہے کہ کوئی بھی شخص اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ اس لئے ایک بے علم یا جاہل آدمی تو سمجھ سکتا ہے کہ میں سب کچھ جانتا ہوں۔ مگر جو آدمی علم کے سمندر میں داخل ہو وہ وہاں سے صرف یہ احساس حاصل کرے گا کہ میں تو کچھ نہیں جانتا۔ اس کا ہر علمی اضافہ صرف اس کے احساس بے علمی کو بڑھائے گا۔

علم کی اسی نوعیت کی بنا پر یہاں ایسا ہوتا ہے کہ جو آدمی علم کی وسیع دنیا سے بے خبر ہو وہ اپنی بے خبری کی بنا پر اس بے بنیاد احساس میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ "میں سب کچھ جانتا ہوں"۔ ایسا آدمی ہمیشہ جہل مرکب میں مبتلا رہتا ہے۔ وہ بے خبر جیتا ہے اور بے خبر ہی مر جاتا ہے۔

حقائق کی دنیا ناقابل بیان حد تک وسیع ہے۔ قیامت تک لوگ اس کو دریافت کرتے رہیں گے مگر کبھی بھی یہ حقائق ختم نہ ہوں گے۔ ایسی حالت میں جو آدمی یہ سمجھ لے کہ میں عالم ہو گیا اس نے گویا اپنے لئے نئی معلومات کا دروازہ بند کر لیا۔ اس کے برعکس جس کا احساس یہ ہو کہ ابھی میں نے نہیں جانا وہ ہر دن اپنے علم میں اضافہ کرتا رہے گا۔ اس کا بے علمی کا احساس اس بات کی ضمانت بن جائے گا کہ اس کی دریافتوں کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہو۔ ہر روز نئی حقیقتوں سے وہ اپنے علمی خزانہ میں اضافہ کرتا رہے۔

شریف، کمینہ

قال العتبی سمعت اعرابیا یقول: اسوأ ما فی الکریم ان یکف عنك خیرہ وخیر مافی اللئیم ان یکف عنك شرہ (الامالی للقالی)

عتبی کا قول ہے کہ میں نے ایک اعرابی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ شریف آدمی کے لئے سب سے بری چیز یہ ہے کہ وہ اپنا خیر تم سے روک دے اور کمینہ آدمی کے لئے سب سے بہتر چیز یہ ہے کہ وہ اپنے شر سے تم کو بچائے۔

شریف آدمی وہ ہے جو دوسروں کے لئے نفع بخش ہو۔ جو بولے تو انصاف اور خیر خواہی کی بات بولے۔ اس کے مال اور اس کے اثاثہ میں دوسروں کا حصہ ہو۔ وہ صرف اپنے لئے نہ جئے بلکہ یہ سمجھ کر زندگی گزارے کہ اس کے اوپر دوسروں کا بھی حق ہے۔

جو شخص شریف ہو یا لوگوں کی نظر میں شریف سمجھا جائے، اس کے لئے یہ بات اسی کی شرافت کے خلاف ہوگی کہ اس سے لوگوں کو فائدہ پہنچنا بند ہو جائے۔ یہ بات اس کے لئے ازالۂ حیثیت عرفی کے ہم معنی ہے کہ اس کا قول اور اس کا عمل دوسروں کے لئے اپنی افادیت کھو دے۔

اس کے برعکس کمینہ آدمی وہ ہے جس کے اندر نفع بخشی کی صلاحیت نہ رہے۔ اس کی زبان لوگوں کی برائی میں کھلے۔ وہ بولے تو بے انصافی اور بد خواہی کی بات بولے۔ وہ صرف لینا جانتا ہو، اس کے یہاں دینے کا کوئی خانہ نہ ہو۔ وہ اپنی ذات کے لئے جی رہا ہو۔ دوسروں سے اس کو کوئی دلچسپی نہ ہو۔

ایسا آدمی دوسروں کے لئے سراپا شر ہوتا ہے۔ دوسروں کے ساتھ اس کا آخری احسان یہ ہے کہ وہ اپنی برائی سے لوگوں کو محفوظ رکھے۔ اس کی کثافت اس کی اپنی ذات تک محدود رہے۔ اس کی کثافت دوسروں تک نہ پہنچنے پائے۔

شریف آدمی خدا کے باغ کا پھول ہے اور کمینہ آدمی خدا کے باغ کا کانٹا۔ شریف آدمی سے لوگوں کو مہک ملتی ہے اور کمینہ آدمی سے صرف تلخی اور اذیت۔

محرومی پر راضی ہونا

دنیا میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو "پانے" کو اپنا مقصد بناتے ہیں۔ دوسرے لوگ وہ ہیں جو اس حوصلہ کا ثبوت دیتے ہیں کہ وہ "دینے" کو اپنا مقصد بنائیں گے۔ پہلی قسم کے لوگ اپنی ذات کو فائدہ پہنچاتے ہیں اور دوسری قسم کے لوگ دنیا میں انقلاب لاتے ہیں، وہ نئی تاریخ پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ تاریخ انسانی میں اس قربانی کا سب بڑا نمونہ وہ گروہ ہے جس کو انصار کہا جاتا ہے۔ یعنی قدیم مدینہ کے وہ لوگ جنھوں نے ہجرت کے بعد رسول اور اصحاب رسول کا ساتھ دے کر خدا کے دین کو دعوت کے مرحلہ سے نکال کر انقلاب کے مرحلہ میں پہنچا دیا۔

انصاریت کیا ہے۔ انصاریت دینے پر راضی ہونا ہے۔ مکہ کے مسلمان جب ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو انصار اس پر راضی ہوئے کہ وہ اپنے گھروں کو اور اپنی جائدادوں کو تقسیم کر دیں۔ ان کا آدھا حصہ خود لیں، اور بقیہ آدھا مہاجرین کو دینے پر راضی ہو جائیں۔ انصار اس یکطرفہ تقسیم پر راضی ہوئے۔ غزوۂ حنین میں بہت بڑی مقدار میں غنائم حاصل ہوئے۔ دوبارہ انصار اس پر راضی ہوئے کہ غنائم سب کے سب مکہ کے لوگوں کو دے دئے جائیں اور انصار کا ان غنائم میں کوئی حصہ نہ ہو۔

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد جب خلیفہ مقرر کرنے کا سوال ہوا تو انصار اس پر راضی ہوئے کہ خلافت پورے طور پر قریش کو دے دی جائے۔ اور انصار کا کوئی آدمی خلیفہ نہ بنایا جائے۔ انصار اس پر راضی ہو گئے کہ خلافت قریش کے لئے ہوگی۔ ان کا کوئی حصہ خلافت میں نہ ہوگا۔

اس دنیا میں لوگ پانے کی بنیاد پر راضی ہوتے ہیں۔ انصار وہ لوگ تھے جو نہ پانے کی بنیاد پر راضی ہوئے۔ یہ قربانی کی اعلیٰ ترین قسم ہے۔ یہ لڑنے مرنے کی قربانی سے ہزاروں گنا زیادہ بڑی ہے۔ یہ قربانی وہ ہے جو تاریخ بناتی ہے۔ تاریخ سازی کا منصوبہ صرف اس وقت کامیاب ہوتا ہے جب کہ کچھ لوگ اس عظیم قربانی کو دینے پر راضی ہو جائیں۔

سکون مطلوب نہیں

ایک کہاوت ہے کہ جہاز بندرگاہ میں زیادہ محفوظ رہتے ہیں۔ مگر جہاز اس لئے نہیں بنائے گئے کہ وہ بندرگاہ میں کھڑے رہیں:

Ships are safer in the harbour, but
they are not meant for that purpose.

انسان اگر اپنے ٹھکانے پر بیٹھا رہے، وہ نہ سفر کرے، نہ کوئی کام شروع کرے، نہ کسی سے معاملہ کرے، تو ایسا آدمی بظاہر محفوظ اور پر سکون ہوگا۔ مگر انسان کو پیدا کرنے والے نے اس کو اس لئے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ پر سکون طور پر ایک جگہ رہے اور پھر وہ مر کر قبر میں چلا جائے۔

انسان کو اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ کام کرے۔ وہ دنیا میں ایک زندگی کی تعمیر کرے۔ اس مقصد کے لئے اس کو دنیا کے ہنگاموں میں داخل ہونا پڑے گا۔ وہ ہارنے اور جیتنے کے تجربات اٹھائے گا۔ اس کو کبھی نقصان ہوگا اور کبھی فائدہ۔ اس قسم کے واقعات کا پیش آنا عین فطری ہے۔ اور ایسے واقعات و حوادث کا اندیشہ ہونے کے باوجود انسان کے لئے یہ مطلوب ہے کہ وہ زندگی کے سمندر میں داخل ہو اور اپنی جدوجہد میں کمی نہ کرے۔

مزید یہ کہ پر سکون زندگی کوئی مطلوب زندگی نہیں۔ کیوں کہ جو آدمی مستقل طور پر سکون کی حالت میں ہو اس کا ارتقاء رک جائے گا۔ ایسے آدمی کے امکانات بیدار نہیں ہوں گے۔ ایسے آدمی کی فطرت میں چھپے ہوئے خزانے باہر آنے کا موقع نہ پا سکیں گے۔

اس کے برعکس ایک آدمی جب زندگی کے طوفان میں داخل ہوتا ہے تو اس کی چھپی ہوئی صلاحیتیں جاگ اٹھتی ہیں۔ وہ معمولی انسان سے اوپر اٹھ کر غیر معمولی انسان بن جاتا ہے۔ پہلے اگر وہ ایک چھوٹا سا بیج تھا تو اب وہ ایک عظیم الشان درخت بن جاتا ہے۔

زندگی جدوجہد کا نام ہے۔ زندگی یہ ہے کہ آدمی مقابلہ کر کے آگے بڑھے۔ زندگی وہ ہے جو سیلاب بن جائے نہ کہ وہ جو ساحل پر ٹھہری رہے۔

زیادہ بڑی گود

ہندستانی روایات میں ایک کہانی اس طرح ہے کہ ایک راجہ کے یہاں دو رانیاں تھیں۔ دونوں رانی کے یہاں ایک ایک بچہ تھا۔ دونوں کے درمیان رقابت رہتی تھی۔ ایک دن ایک رانی کا بچہ راجہ کی گود میں آکر بیٹھ گیا۔ دوسری رانی نے اس منظر کو دیکھا تو اسے غصہ آگیا۔ وہ اپنے بیٹے کو لے کر آئی اور دوسری رانی کے بیٹے کو ہٹا کر اپنے بیٹے کو راجہ کی گود میں بٹھادیا۔

بچہ روتا ہوا اپنی ماں کے پاس گیا اور پورا قصہ بتایا۔ ماں نے کہا کہ اے میرے بیٹے، تم پرم پتا کی گود میں بیٹھ جاؤ۔ اس کے بعد تمہیں ان باتوں کی شکایت نہ ہوگی۔

یہ ایک تمثیلی کہانی ہے۔ تاہم اس میں بہت بڑا سبق ہے۔ انسان عام طور پر مختلف قسم کی شکایتیں لئے رہتا ہے۔ اس کو اپنے گھر والوں کی طرف سے اور سماج کے لوگوں کی طرف سے مختلف قسم کے ناپسندیدہ تجربات پیش آتے رہتے ہیں جو شکایت بن کر اس کے سینہ میں بس جاتے ہیں۔ مگر یہ سب بہت چھوٹی باتیں ہیں۔ زیادہ بڑی بات یہ ہے کہ آدمی خدا کی یادوں میں جینے والا بنے۔ وہ اپنا سارا بھروسہ خدا پر قائم کرے۔ وہ خدا کی دی ہوئی چیزوں کی عظمت میں اس طرح گم ہو کہ اس کو یاد ہی نہ رہے کہ کسی اور نے اس کو کیا دیا اور کیا نہیں دیا۔

انسانوں سے شکایت دراصل خدا سے غفلت کا نتیجہ ہے۔ خدا کی طرف سے انسان کو جو بے شمار نعمتیں ملی ہوئی ہیں وہ ایک اتھاہ سمندر کی مانند ہیں اور انسانوں کی طرف سے جو کچھ پیش آتا ہے وہ اس کے مقابلہ میں ایک قطرہ سے بھی کم ہے۔ عطیات الٰہی کے اس سمندر میں اگر کوئی شخص اپنی طرف سے ایک قطرہ اور ڈال دے تو سمندر میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اس سمندر سے ایک قطرہ نکال لے تب بھی اس میں کوئی کمی واقع ہونے والی نہیں۔

ہر آدمی "پرم پتا" کی گود میں بیٹھا ہوا ہے۔ اس واقعہ کا شعوری ادراک اگر پوری طرح حاصل ہو جائے تو آدمی بڑی سے بڑی شکایت کو اس طرح نظر انداز کردے گا جیسے کہ اس کی کوئی حقیقت ہی نہیں۔

قدرتی ڈھال

چنگیز خاں کا پوتا ہلاکو خاں وحشی تاتاری قبائل کی فوج لے کر ۱۲۵۸ء میں بغداد میں داخل ہوا اور اس کو تباہ کر ڈالا۔ اس کے بعد عرصہ تک وہ لوگ مسلم دنیا کو اپنی تخریب کاری کا نشانہ بناتے رہے۔ امام ابن تیمیہ (۱۳۲۸-۱۲۶۳ء) کا زمانہ وہی ہے جو اس تاتاری فتنہ کا زمانہ ہے۔

دمشق میں ایک بار ابن تیمیہ ایک مقام سے گزر رہے تھے۔ اس مقام پر تاتاریوں کا ایک گروہ پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ اس وقت وہ لوگ شراب نوشی میں مشغول تھے۔ ابن تیمیہ کے بعض ساتھیوں نے چاہا کہ ان کے پاس جائیں اور ان کو شراب پینے سے روکیں۔ ابن تیمیہ نے اپنے ساتھیوں کو منع کیا۔ انھوں نے کہا کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ جب تک یہ لوگ نشہ کی حالت میں رہیں گے، مسلمان ان کی جارحیت سے محفوظ رہیں گے۔ ان کی ہوش کی حالت کے مقابلہ میں ان کی مدہوشی کی حالت زیادہ بہتر ہے (سکرھم خیر من صحوھم)

موجودہ دنیا میں عافیت کی زندگی حاصل کرنے کی لئے یہ ایک قیمتی اصول ہے۔ لوگوں کو ان کی دلچسپیوں میں مشغول رہنے دیجئے، آپ ان کے فتنوں سے محفوظ رہیں گے۔

یہ اصول دور جدید کے "تاتاریوں" پر مزید اضافہ کے ساتھ چسپاں ہوتا ہے۔ موجودہ صنعتی دور کے تاتاری اس سے بھی زیادہ بڑے نشے میں مبتلا ہیں۔ یہ دولت کمانے کا نشہ ہے۔ جدید صنعتی انقلاب نے دولت کمانے کے بے حساب نئے مواقع کھول دئے ہیں۔ چنانچہ ہر آدمی اپنی ساری توجہ زیادہ سے زیادہ کمائی کرنے میں لگائے ہوئے ہے۔ برادران وطن میں یہ کیفیت اور بھی زیادہ ہے۔ کیوں کہ وہ دولت کو دیوتا کا درجہ دیتے ہیں۔

ایسی حالت میں لوگوں کے شر سے بچنے کی سب سے آسان صورت یہ ہے کہ وہ جس "نشہ" میں مشغول ہیں انھیں اسی نشہ میں مشغول رہنے دیا جائے۔ دولت پرستی خود ان پرستاروں کے لئے بری چیز ہے۔ مگر دوسروں کے لئے وہ ان کے مقابلہ میں ایک قدرتی ڈھال بن جاتی ہے۔

سچائی کی طاقت

ایک صاحب اپنے خط مورخہ ۲۷ فروری ۲۰۰۰ میں لکھتے ہیں: مراد آباد میں ہماری ایک پرچون کی دکان (General Store) ہے۔ ہم دکان پر اخبار اور کاپی کی ردّی بھی خریدتے ہیں۔ ایک بار 'الرسالہ' کے کچھ پرانے شمارے مجھے ردّی میں ملے اور میں انھیں گھر لے آیا۔ جب ان کو پڑھ کر دیکھا تو مجھے آپ کے مضامین بہت اچھے لگے۔ پھر میں نے حریم بک ہاؤس (جو کہ محلہ مغلپورہ مراد آباد میں واقع ہے) سے اکتوبر ۱۹۹۸ کا الرسالہ لیا اور اس کے بعد جنوری ۱۹۹۹ سے ہر مہینہ کا الرسالہ لے کر پڑھتا ہوں۔ الرسالہ کو میں ایک نصیحت نامہ سمجھتا ہوں۔ (ارشد علی، محلہ پیرزادہ، مراد آباد)

یہ چھوٹا سا واقعہ ایک بہت بڑی حقیقت کو بتاتا ہے۔ وہ یہ کہ سچائی اپنے اندر لامحدود طاقت رکھتی ہے۔ سچائی ایک ایسا سیلاب ہے جس کو روکنا کسی بھی شخص کے لئے ممکن نہیں۔

سچائی کو اگر کوئی شخص ناقدری کرتے ہوئے اسے "ردّی" میں فروخت کر دے تب بھی اس کا یہ فعل سچائی کو اس کے قدر داں تک پہنچانے کا ذریعہ بن جائے گا۔ سچائی کے خلاف اگر کوئی پروپیگنڈے کی مہم چلائے تو اس قسم کی مہم صرف سچائی کی اشاعت میں اضافہ کرے گی۔ سچائی کو اگر کوئی شخص اس کے وطن سے نکال دے تو عملاً صرف یہ ہوگا کہ سچائی ملکی دائرے سے نکل کر بین اقوامی دائرہ میں داخل ہو جائے۔ غرض سچائی کے خلاف ہر کارروائی سچائی کے حق میں ایک نیا دروازہ کھولنے کے ہم معنی ثابت ہوگی۔

سچائی اپنے آپ میں طاقت ہے۔ سچائی جب بھی کھڑی ہوتی ہے فطرت کے تمام قوانین اس کی حمایت میں سرگرم ہو جاتے ہیں۔ تاریخ کے تمام عوامل اس کے حق میں جمع ہونے لگتے ہیں۔ سچائی ایک ایسی ابدی حقیقت ہے جو مغلوب ہو کر بھی غالب رہتی ہے۔ سچائی اگر بظاہر خاکستر دکھائی دے تب بھی اس کے اندر ایک ایسا شعلہ موجود رہتا ہے جو بھڑک کر ساری دنیا کو روشن کر دے۔

مسلسل کوشش

سید فرید الوحیدی (پیدائش ۱۹۳۰) مشہور مجاہد آزادی مولانا وحید احمد مدنی (وفات ۱۹۳۸) کے صاحبزادے ہیں۔ مولانا مرحوم برٹش دور میں ان علماء کے ساتھ تھے جن کو مالٹا میں نظر بند (۲۰-۱۹۱۸) کیا گیا تھا۔ جناب سید فرید الوحیدی صاحب نے ابتدائی تعلیم دار العلوم دیوبند میں حاصل کی۔ اس کے بعد انھوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے عربی میں ایم اے کیا۔ اس کے علاوہ بی ایڈ بھی کیا۔ ان کے لئے یہ موقع تھا کہ وہ اپنی بی ایڈ کی ڈگری کو استعمال کر کے کسی اسکول یا کالج میں ملازمت حاصل کر لیں۔ یہ ان کے لئے سہولت کی زندگی ہوتی۔ مگر سہولت کو ترک کر کے انھوں نے محنت کا راستہ اختیار کیا۔ انھوں نے ملازمت کے بجائے تجارت کو اپنی جد و جہد کا میدان بنایا۔ اب وہ اس حدیث رسول کی ایک زندہ تفسیر ہیں کہ: تسعة اعشار الرزق فی التجارة (رزق کا ۹۰ فیصد حصہ تجارت میں ہے)۔

تاہم اپنے حالات کے اعتبار سے تجارت کو اختیار کرنا ان کے لئے آسان راستہ کو چھوڑ کر مشکل راستہ کو اختیار کرنا تھا۔ کیونکہ تجارت کے لئے سرمایہ درکار تھا۔ اور ان کے پاس سرمایہ موجود نہ تھا۔ مگر انھوں نے اپنے عمل سے اس مشہور مقولہ کی صداقت کو ثابت کر دیا کہ ـــــ محنت ہر چیز کا بدل ہے۔

جب ان کی عمر تقریباً ۲۰ سال تھی، انھوں نے سرمہ سے اپنی تجارت کا آغاز کیا۔ اس وقت ان کے پاس کوئی رقم نہ تھی۔ انھوں نے کسی سے دس روپیہ بطور قرض حاصل کیا۔ اس کے بعد انھوں نے سرمہ کی ڈلیاں خریدیں۔ کسی سے عاریۃً کھرل حاصل کیا۔ اور رات دن کی محنت سے ڈلیوں کو پیس کر سرمہ بنایا۔ پھر اس کو شیشیوں میں بھرا۔ انھوں نے اپنے سرمہ کا نام سرمہ نور رکھا۔ اس وقت کوئی دکان دار ان کے غیر مشہور سرمہ کو اپنی دکان پر رکھنے کے لئے تیار نہ ہو سکتا تھا۔ اس کا حل انھوں نے یہ نکالا کہ وہ ایک دن دیوبند ریلوے اسٹیشن پر ٹرین میں سوار ہو گئے اور

مسافروں کے سامنے اپنے سرمہ کا تعارف کرانا شروع کیا۔ جب انھوں نے سرمہ کا تعارف کراتے ہوئے خوش آوازی کے ساتھ یہ شعر پڑھا: لگالو پیاری آنکھوں میں یہ ڈنڈو شاہ کا سرمہ۔ تو تمام مسافران کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اور پہلے ہی دن ان کے سرمہ کی تمام شیشیاں فروخت ہو گئیں۔

سرمہ کے کاروبار میں زیادہ گنجائش نہ دیکھ کر انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ انہیں کوئی دوسرا کام کرنا چاہئے۔ اب انہوں نے دیوبند میں کتابوں کی ایک دکان کھولی۔ اس کا نام انہوں نے قومی کتاب گھر رکھا۔ یہاں وہ کتاب فروخت کرنے لگے۔ مگر کتابوں کا کام محنت کے باوجود زیادہ آگے نہ بڑھ سکا۔ انہیں نظر آیا کہ اس کام میں ان کے لئے موجودہ حالت میں زیادہ ترقی کے مواقع نہیں ہیں۔ پھر انہوں نے تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا۔ انہوں نے سیرت رسول اور تاریخ اسلام پر کئی نصابی کتابیں لکھیں جو اتنی زیادہ مقبول ہوئیں کہ اب تک ان کے سیکڑوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

انہوں نے محسوس کیا کہ یہ کام بھی ان کے اقتصادی حوصلوں کی تسکین کے لئے کافی نہیں۔ چنانچہ ۱۹۶۱ میں وہ ہندستان سے ایک عرب ملک میں چلے گئے۔ ابتداء میں وہاں انہوں نے مختلف ملازمتیں کیں۔ اس کے بعد انہوں نے ایک شہر میں ایک تجارتی کام کا آغاز کیا۔ یہ الدعایۃ والاعلان (ایڈورٹائزنگ) کا کام تھا۔ انہوں نے اپنے اس کام میں پورا اہتمام کیا کہ گاہکوں کو جو سامان سپلائی کیا جائے وہ اعلیٰ معیار کا ہو۔ یہاں تک کہ اعلیٰ معیار ان کی کمپنی الوحیدی کی پہچان بن گیا۔ ان کی کمپنی الوحیدی کے نام سے مشہور ہے۔ اب اس کے دفاتر وہاں کے تین بڑے شہروں میں ہیں۔ ۲۰ سال کی مسلسل محنت کے بعد ان کا کام اتنا زیادہ بڑھ چکا ہے کہ اب ایڈورٹائزنگ بزنس میں عرب دنیا میں ان کی کمپنی کا درجہ تیسرے نمبر پر ہے۔

ایک شخص جس نے ۱۹۵۰ میں دس روپیہ بطور قرض حاصل کر کے اپنی چھوٹی سی تجارت شروع کی تھی، وہ ۲۰۰۰ء میں اس حیثیت کو پہنچ چکا ہے کہ اب اس کے تجارتی ادارے میں ساٹھ آدمی کام کر رہے ہیں۔ ان کو وہ ہر مہینہ ایک لاکھ ریال تنخواہ دیتا ہے۔ یہ رقم ہندستانی سکہ کے اعتبار سے ۱۰ لاکھ روپیہ سے زیادہ ہوتی ہے۔

سید فرید الوحیدی صاحب کو کامیابی اس طرح نہیں ملی کہ ان کو اچانک چھپر پھاڑ کر کوئی خزانہ مل گیا۔ بلکہ ان کی کامیابی تمام تر محنت اور مسلسل محنت کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے نوجوانی کی عمر میں مولانا اسماعیل میرٹھی کی ریڈریں پڑھیں۔ ان سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ مولانا اسماعیل میرٹھی کے یہ اشعار ان کی زندگی کے لئے رہنما ثابت ہوئے:

جو پتھر پہ پانی پڑے متصل تو بے شبہ گھس جائے پتھر کی سل
رہو گے اگر تم یونہی مستقل تو اک دن نتیجہ بھی جائے گا مل
کئے جاؤ کوشش مرے دوستو

سید فرید الوحیدی صاحب جب زندگی کی جدوجہد میں داخل ہوئے تو ابتداءً تقریباً بیس سال تک انہیں مختلف قسم کے معمولی کام کرنے پڑے۔ اس زمانہ میں وہ صبح سے شام تک اکیلے محنت کرتے تھے۔ محنت کے ساتھ انہوں نے دیانت داری (honesty) کو اپنا لازمی اصول بنالیا۔ انہوں نے خود نقصان اٹھایا مگر کبھی کسی دوسرے کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔ بیس سال کے بعد وہ وقت آیا جب کہ ان کا کام بڑھا اور انہوں نے مزید کارکن رکھ کر کمپنی کی صورت میں کام کرنا شروع کیا۔ انہوں نے شہر کی سڑکوں پر پیدل چل کر اپنے کام کا آغاز کیا تھا، اب وہ اس پوزیشن میں ہو چکے ہیں کہ جدید ترین کمیونی کیشن استعمال کر کے انٹرنیشنل بزنس کر سکیں۔

۵ فروری ۲۰۰۰ کو دہلی میں سید فرید الوحیدی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے جو اقتصادی ترقی حاصل کی اس کا راز کیا تھا۔ اس سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ مختصر طور پر میری ترقی کا راز یہ تھا ــــــ سادہ زندگی اور بلند سوچ:

Simple living, high thinking

انہوں نے کہا کہ کسی بھی کامیابی کے لئے مسلسل جدوجہد لازمی شرط ہے اور سادہ زندگی اور بلند سوچ آپ کو اس قابل بناتی ہے کہ آپ اپنے مقصد کے لئے وہ مطلوب عمل کر سکیں جس کو مسلسل جدوجہد کہا جاتا ہے۔

تخلیقی منصوبہ

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب انسان جیسی مخلوق پیدا کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو فرشتوں نے اس کو سن کر کہا: اتجعل فیھا من یفسد فیھا و یسفك الدماء ونحن نسبح بحمدك و نقدس لك قال انی اعلم مالا تعلمون (البقرہ ۳۰) یعنی کیا تو زمین میں ایسی مخلوق بسائے گا جو اس میں فساد کرے اور خون بہائے اور ہم تیری حمد کرتے ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔ اللہ نے کہا میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

انسانی تاریخ کا تجربہ بتاتا ہے کہ فرشتوں کا یہ اندیشہ بالکل درست تھا کہ انسان جیسی آزاد مخلوق یہی کرے گی کہ وہ زمین پر فساد برپا کرے اور خون بہائے۔ اسی کے ساتھ فرشتوں کا یہ کہنا بھی درست تھا کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوقات سے جو چیز مطلوب ہے وہ حمد و تقدیس ہی ہے جو عملاً ساری کائنات میں ہو رہی ہے۔ اس کے باوجود اللہ نے انسان جیسی مخلوق کو کیوں پیدا کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کائنات خدا کی مجبورانہ تسبیح و تقدیس کر رہی ہے۔ اب خدا کو مطلوب تھا کہ ایک ایسی مخلوق ہو جو خدا کی اختیارانہ تسبیح و تقدیس کرے۔ اور یہ مقصد انسان جیسی بااختیار مخلوق کی پیدائش ہی کے ذریعہ ممکن تھا۔

خدا کے تخلیقی منصوبہ کی نسبت سے اصل قابل لحاظ بات یہ نہیں ہے کہ انسان فساد اور خونریزی کرتا ہے۔ اصل قابل لحاظ بات یہ ہے کہ اسی طرح کے پرخطر ماحول میں ان روحوں کا انتخاب کیا جا سکتا ہے جو خدا کی معیاری جنت میں بسائے جانے کے قابل ہوں۔ کسی اور ماحول میں ایسے قیمتی افراد کی پیدائش ممکن نہیں۔

خدا کو اپنی جنت میں بسانے کے لئے ایسے افراد درکار ہیں جو اختیاری تسبیح و تقدیس کا ثبوت دیں۔ اہل دماغ اپنے دماغ کے غلط استعمال سے دنیا کو افکار کا اندھیرا جنگل بنا دیں پھر بھی ایک طالب حق اس کے اندر سچائی کو دریافت کرے اور اس کو اپنا لے۔ حالات کی کشاکش میں کوئی

شخص آخری حد تک غیر محفوظ (vulnerable) ہو جائے۔ مگر ایک اللہ کا بندہ اس پر قابو پانے کے باوجود اس کی غیر محفوظیت کو استعمال نہ کرے۔ عملی حالات کسی کو اقتدار اعلیٰ کا مالک بنادیں مگر وہ اپنے اقتدار کا غلط استعمال نہ کرے۔ آزاد اقتصادی عمل کے دوران کسی کے پاس دولت کا ڈھیر جمع ہو جائے۔ مگر وہ اس دولت کو بھلائی کے راستوں میں فیاضی کے ساتھ خرچ کرے وغیرہ۔

ملائکہ کی پیدائش سے یہ مقصود تھا کہ ایک ایسی مخلوق وجود میں آئے جو تسبیح و تقدیس کے لئے پیدا کی گئی ہو اور وہ مکمل طور پر اور بلا انحراف تسبیح و تقدیس کے اسی عمل میں مصروف رہے۔ اس کے برعکس انسان کے بارے میں خدا کا تخلیقی منصوبہ یہ تھا کہ ایک ایسی مخلوق وجود میں آئے جس کو خونریزی اور ہر قسم کے فساد کا مکمل اختیار حاصل ہو، اس کے باوجود وہ پوری طرح خونریزی اور فساد سے بچے اور اپنے آزادانہ اختیار کے تحت تسبیح میں مشغول ہو جائے۔

جنت کیا ہے۔ جنت خدا کی بنائی ہوئی معیاری دنیا ہے۔ وہاں ہر قسم کے سامان حیات اپنی نفیس ترین صورت میں مہیا کئے گئے ہیں۔ وہاں نہ کسی قسم کا غم ہے اور نہ کسی قسم کا اندیشہ۔ وہ ہر قسم کی محدودیتوں سے کامل طور پر پاک ہے۔ مزید یہ کہ وہاں انسان کے لئے ممکن ہوگا کہ وہ بلا روک ٹوک اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کی تکمیل کر سکے۔

ایسی نفیس دنیا صرف نفیس روحوں کے لئے مقدر ہے اور یہ نفیس روحیں وہی ہیں جو ناموافق اسباب کا پردہ پھاڑ کر خدا کی معرفت حاصل کریں۔ جو ہر قسم کی سرکشی کو چھوڑ کر اپنے آپ کو خدا کی تابعداری میں دے دیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو بولنے کی آزادی تھی مگر وہ خدا کے خوف سے نہیں بولے۔ جن کو دوسروں کے اوپر دست درازی کا موقع تھا مگر انہوں نے اپنے ہاتھوں کو روک لیا۔ جو دوسروں کو بے عزت کر سکتے تھے مگر وہ جہنم کے اندیشے سے ایسی کارروائی سے باز رہے۔ جو دوسروں کی چیز کو اپنی چیز بنا سکتے تھے مگر آخرت کی پکڑ نے انہیں ایسا کرنے نہیں دیا۔ جن کی انا حقیقت کے اعتراف میں مانع تھی مگر انہوں نے اپنی انا کو کچل کر حقیقت کا کھلا اعتراف کیا۔

ایمان ایک معرفت

قرآن میں کچھ مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ : قالت الاعربا آمنا قل لم تومنوا ولکن قولوا اسلمنا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم (الحجرات ۱۴) یعنی اعراب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ کہو کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ یوں کہو کہ ہم نے اسلام قبول کیا اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔

دوسری طرف قرآن میں کچھ اور مسلمانوں کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے: اور جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسول پر اتارا گیا ہے تو تم دیکھو گے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اس سبب سے کہ انھوں نے حق کو پہچان لیا۔ وہ پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم ایمان لائے۔ پس تو ہم کو گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔ اور ہم کیوں نہ ایمان لائیں اللہ پر اور اس حق پر جو ہمیں پہنچا ہے جب کہ ہم یہ آرزو رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہم کو صالح لوگوں کے ساتھ شامل کر لے۔ پس اللہ ان کو اس قول کے بدلہ میں ایسے باغ دے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور یہی بدلہ ہے نیک عمل کرنے والوں کا۔ (المائدہ ۸۳۔۸۵)

ان دونوں آیتوں کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کی حقیقت کیا ہے۔ وہ کون خوش نصیب لوگ ہیں جن کے ایمان کو اللہ تعالیٰ کے یہاں قبولیت حاصل ہو گی اور وہ ابدی جنتوں میں داخل کیے جائیں گے، جہاں وہ کبھی نہ ختم ہونے والی خوشیوں اور راحتوں میں زندگی گزاریں گے۔

۱۔ پہلی بات یہ کہ اللہ تعالیٰ کا مطلوب ایمان وہ ہے جو داخل القلب ایمان (الحجرات ۱۴) ہو، صرف زبان سے ایمان کے کلمات ادا کر دینا وہ چیز نہیں جس کی بنا پر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے یہاں مومن یا صاحب ایمان شمار کیا جائے۔ زبان سے جو کلمۂ ایمان ادا کیا جاتا ہے وہ در حقیقت آدمی کی طرف سے قبولیتِ ایمان کا ایک لفظی اظہار ہے۔ اصل مطلوب ایمان یہ ہے کہ ایمان کی

حقیقت دل کی گہرائیوں میں داخل ہو جائے، وہ آدمی کے شعور کا سب سے زیادہ اہم حصہ بن جائے، اسی کے ذریعہ آدمی کی شخصیت کی تعمیر ہونے لگے۔

۲۔ دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان معرفت حق کا دوسرا نام ہے۔ آدمی جب اپنے آپ کو اور خالق کو صحیح طور پر پہچانے اور شعور کی گہرائیوں کے ساتھ یہ جان لے کہ وہ صرف ایک عاجز بندہ ہے اور ہر قسم کی بڑائیاں اور تمام قسم کے کمالات صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہیں، پھر یہ علم اس کو اس حد تک متاثر کرے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کے آگے ڈال دے، تو اسی گہرے ایمانی تجربہ کا نام معرفت ہے، اور یہ معرفت ایمان کا آغاز ہے۔ ایمان جب تک حق کی گہری معرفت نہ بنے اللہ کے نزدیک اس کی کوئی قیمت نہیں۔

۳۔ اس عارفانہ ایمان کی ایک علامت یہ ہے کہ ایک آدمی کو اس کا تجربہ ہوتا ہے کہ اس کی آنکھوں سے آنسو کا سیلاب بہہ پڑتا ہے۔ یہ تجربہ اس کی اندرونی شخصیت میں ایک زلزلہ پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے اندر ایک زبردست قسم کی روحانی ہلچل برپا ہو جاتی ہے۔ یہی گہرے آنسو گویا اس کے اندر برپا ہونے والے اس داخلی انقلاب کی تصدیق ہوتے ہیں۔ جس معرفت حق کے ساتھ آنسوؤں کی یہ تصدیق شامل نہ ہو، وہ معرفت حق اللہ تعالیٰ کے یہاں معتبر نہیں۔

۴۔ یہ ایمان کوئی سادہ بات نہیں، اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ ایک کائناتی شہادت ہے۔ یہ حقائق خداوندی کو دیکھنے سے پہلے گویا اس کا مشاہدہ کر لینا ہے۔ یہ مجبورانہ اعتراف کا وقت آنے سے پہلے اس کا اختیارانہ اعتراف کرنا ہے۔ یہ اس خداوند ذوالجلال کے حق میں اپنی گواہی درج کرنا ہے جس کی گواہی ہر لمحہ خدا کے مقدس فرشتے انجام دے رہے ہیں۔

۵۔ ایمان دراصل دنیا کے مقابلہ میں آخرت کو ترجیح دینے کا فیصلہ ہے۔ یہ دنیا کی نعمتوں کے مقابلہ میں آخرت کی نعمتوں کا طالب بننا ہے، جو لوگ اپنے سارے دل اور اپنے سارے دماغ کے ساتھ اس طلب کا ثبوت دیں وہی وہ روحیں ہیں جن کو جنت کے ابدی باغوں میں داخل کیا جائے گا، جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے اور کبھی اس سے باہر آنے کی تمنا نہ کریں گے۔

فطری حل

ہندستان کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ یہاں کے مسلمان اکثریتی فرقہ کی طرف سے تعصب اور زیادتی کا شکار ہیں۔ اس ملک میں مسلمانوں کے لئے یہ مواقع نہیں کہ وہ پر امن طور پر یہاں رہیں اور تعمیر و ترقی کے راستہ میں سرگرم ہوں۔ مگر یہ بات سراسر بے بنیاد ہے۔ اس کی حقیقت جاننے کا سادہ سا طریقہ یہ ہے کہ جو شخص یہ کہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کو تباہ کیا جا رہا ہے اس سے پوچھئے کہ تم خود کیوں تباہی سے بچے ہوئے ہو۔ اسی طرح جو مسلم اخبار اس قسم کی باتیں چھاپے اس کے بارے میں تحقیق کیجئے کہ اس اخبار کا مالک تباہی کا شکار ہے یا ترقی کر رہا ہے۔ تقریباً یقینی ہے کہ ہر بار تحقیق سے یہی معلوم ہوگا کہ جو لوگ مسلمانوں کو اس قسم کی خبریں سناتے ہیں وہ خود اس ملک میں زبردست ترقی کئے ہوئے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر دوسرے ملک کی طرح ہندستان میں بھی بعض استثنائی واقعات ہوتے ہیں۔ اب لکھنے اور بولنے والے لوگ یہ کرتے ہیں کہ انہی استثنائی واقعات کو بڑھا چڑھا کر چھاپتے ہیں اور بیان کرتے ہیں۔ اس طرح لوگوں کے ذہنوں میں ہندستان کی ایک ایسی تصویر بنتی ہے جو واقعہ کے مطابق نہیں۔ وہ استثناء کو عموم سمجھ لیتے ہیں حالانکہ اس قسم کا استثناء ہمیشہ اور ہر سوسائٹی میں موجود رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ منفی واقعات اگر ایک فیصد ہیں تو مثبت واقعات ۹۹ فیصد۔ اس سلسلہ میں یہاں ایک مثبت واقعہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔

مشتاق احمد صاحب (پیدائش ۱۹۳۲ء) سے ۱۷ فروری ۲۰۰۰ کو دہلی میں ملاقات ہوئی۔ وہ حج کے لئے جاتے ہوئے دہلی میں ٹھہرے تھے۔ وہ شیو گنج (راجستھان) کے رہنے والے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ جب میں حج کے ارادہ سے شیو گنج سے روانہ ہوا تو وہاں کے نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ ہندوؤں نے بھی زبردست خوشی کا اظہار کیا۔ ہر ایک نے مجھے ہار پہنایا۔ تقریباً ڈیڑھ سو آدمی پہنچانے کے لئے ریلوے اسٹیشن آئے۔ ان میں کافی تعداد ہندوؤں کی

تھی۔ ہر ایک نے کہا کہ وہاں پہنچ کر ہمارے لئے دعا کیجئے گا۔

انہوں نے بتایا کہ شیو گنج میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات بہت اچھے ہیں۔ شر پسند افراد یہاں آتے ہیں مگر ان کی کوشش کامیاب نہیں ہوتی۔ مثلاً ایک کٹر ہندو لیڈر ۱۹۹۲ء میں آئے۔ انہوں نے رات کے جلسہ میں نہایت زہریلی تقریر کی۔ انہوں نے ہندوؤں سے یہاں تک کہا کہ مسلمانوں کا مکمل بائیکاٹ کرو اور ان سے لین دین نہ کرو اور کوئی دکان انہیں کرایہ پر نہ دو۔ اگر دیا ہو تو زبردستی خالی کرالو، وغیرہ۔ واضح ہو کہ شیو گنج کی تجارت تقریباً ۹۹ فی صد ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے۔

مشتاق صاحب نے یہ قصہ بتاتے ہوئے کہا کہ شیو گنج میں مسلمان صرف پانچ فی صد ہیں۔ رات کی اس زہریلی تقریر کے بعد ہم لوگ یہ سوچنے لگے کہ دیکھیں صبح کو کیا ہوتا ہے۔ تاہم مسلمانوں نے اس کے خلاف کوئی احتجاج یا مظاہرہ نہیں کیا، نہ جلسہ کے اندر اور نہ جلسہ کے باہر۔

اس انتہائی دل آزار تقریر کے باوجود شیو گنج کے مسلمانوں نے اس کے خلاف کوئی احتجاجی کارروائی نہیں کی۔ صرف یہ ہوا کہ جناب محمد امین صاحب جو شیو گنج کے ایک مسلم تاجر ہیں وہ وہاں کے ایک ہندو پنڈت پکھراج شریمالی سے ملے۔ وہ وشو ہندو پریشد کے مقامی لیڈر ہیں۔ محمد امین صاحب نے ان سے پوچھا کہ رات کو جو تقریر مہاراج نے کی ہے اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ کیا آپ اس کو ٹھیک سمجھتے ہیں۔ پنڈت پکھراج شریمالی صاحب نے جواب دیا کہ یہ سب بکواس ہے۔ شیو گنج میں ہندو اور مسلمان بھائی بھائی کی طرح رہتے آئے ہیں اسی طرح رہیں گے۔ یہاں اس کا کوئی اثر ہونے والا نہیں۔ چنانچہ خود یہاں کے ہندوؤں نے مذکورہ تقریر کی بھرپور بھرشنا (مذمت) کی اور شیو گنج کے ماحول میں اس کا کوئی عملی اثر نہیں ہوا۔

اصل یہ ہے کہ انسان کی فطرت امن کو پسند کرتی ہے۔ ہر انسان پیدائشی طور پر معتدل ماحول چاہتا ہے کیوں کہ معتدل ماحول میں ہر ایک کا فائدہ ہے۔ جب شیو گنج کے مسلمانوں نے اپنی طرف سے کوئی جوابی کارروائی نہیں کی تو گویا کہ انہوں نے انسانی فطرت کو اپنا عمل کرنے کا موقع

دیا۔ اور انسانی فطرت اپنا وزن ہمیشہ امن کے حق میں ڈالتی ہے۔ اس کے خلاف صرف اس وقت ہوتا ہے جب کہ کوئی نادان لیڈر کھڑا ہو اور جوابی اشتعال انگیزی کر کے معاملہ کو غیر ضروری طور پر اس طرح بڑھائے کہ فطرت کے لئے اپنا کام کرنے کا موقع باقی نہ رہے۔

فطرت کا ایک اصول

زمین پر چھوٹے بڑے بے شمار حیوانات ہیں۔ وہ ہر لحہ اپنے اندر سے گندگی نکالتے رہتے ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ زمین بدستور صاف ستھری حالت میں موجود رہتی ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ وہ حیوانی غلاظت سے بھر جائے۔

اس کا سبب فطرت کا ایک قانون ہے۔ جب بھی کوئی حیوان غلاظت خارج کرتا ہے تو عین اسی وقت بے شمار چھوٹے چھوٹے ناقابلِ مرئی کیڑے (bacteria) اس پر جمع ہو جاتے ہیں۔ وہ اس کو ڈیکمپوز (decompose) کر کے گیس کی صورت میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد یہ گیس اوپر اٹھ کر فضا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔

یہ فطرت کا ایک عام قانون ہے۔ وہ جس طرح بقیہ دنیا میں جاری ہے اسی طرح وہ انسانی دنیا میں بھی جاری ہے۔ جب بھی انسانی دنیا میں کوئی برائی پیدا ہوتی ہے تو عین اسی وقت قدرت کا قانون عمل میں آجاتا ہے۔ وہ اس برائی کو ختم کر کے دوبارہ اس کو معتدل حالت میں قائم کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ فطرت کا یہ عمل مسلسل جاری رہتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنی آخری تکمیل تک پہنچ جائے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ناخوشگوار صورت حال پیش آنے کے بعد اگر ہم خود اقدام نہ کریں تو فطرت اپنے آپ اس کے خلاف سرگرم ہو جائے گی۔ اور ناخوشگوار صورت حال کو دوبارہ خوش گوار صورتِ حال میں تبدیل کر دے گی۔ انسان کی مداخلت کا انجام یقینی نہیں مگر فطرت کی مداخلت کا انجام یقینی ہے، فطرت خدا کے قانون کا نام ہے۔ اور خدا کا قانون جب عمل میں آجائے تو اس کو انجام تک پہنچنے سے کوئی روکنے والا نہیں۔

مطالعۂ قرآن

ایک آسمانی کتاب کا کسی انسان پر اترنا ایک انتہائی غیر معمولی واقعہ ہے۔ قدیم عرب میں یہ غیر معمولی واقعہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتہ جبرئیل کے ذریعہ قرآن کو مکہ کے محمد بن عبد المطلب کے اوپر اتارا۔ قرآن کا یہ نزول تقریباً تیئس سال میں پورا ہوا۔ اس کا ابتدائی حصہ ۶۱۰ء میں مکہ میں اترا اور اس کا آخری حصہ ۶۳۲ء میں مدینہ میں نازل ہوا۔

دلائل قرآن

یہ قرآن کس طرح پیغمبر اسلام پر اترا۔ اس کا ذکر قرآن میں ان الفاظ میں آیا ہے: وإنه لتنزيل رب العالمين نزل به الروح الامين على قلبك لتكون من المنذرين، بلسان عربي مبين، وإنه لفي زبر الاولين، (الشعراء ۱۹۲-۱۹۶) یعنی اور بے شک یہ خداوند عالم کا اتارا ہوا کلام ہے۔ اس کو امانت دار فرشتہ لے کر اترا ہے۔ تمہارے دل پر تاکہ تم ڈرانے والوں میں سے بنو۔ صاف عربی زبان میں اور اس کا ذکر اگلے لوگوں کی کتابوں میں ہے۔

نزول وحی (روح) کی مزید تفصیلات حدیث میں آئی ہیں۔ وحی کی حقیقت کے بارے میں عرب میں سوال کیا گیا تو قرآن میں اس کا جواب اس طرح دیا گیا: ويسئلونك عن الروح، قل الروح من أمر ربي و ماأوتيتم من العلم الا قليلاً (بنی اسرائیل ۸۵) یعنی اور وہ تم سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہو کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے۔ اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سوال کے سلسلہ میں اصل مسئلہ اس کا براہ راست جواب دینے کا نہیں ہے بلکہ خود سائل کی اپنی محدودیت کا ہے۔ کیوں کہ سائل اپنی فطری محدودیت کی بنا پر اس مسئلہ کو صرف جزئی طور پر ہی سمجھ سکتا ہے، وہ کلی معنی میں اس کی نوعیت کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ یہ جواب عین سائنٹفک ہے۔ دنیا کی تمام چیزوں کے مطالعہ کے لئے سائنس میں عین یہی

طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ خود سائنسی تحقیق نے بتایا ہے کہ انسان اپنی پیدائشی محدودیت کی بنا پر کسی علم کا کلی احاطہ نہیں کر سکتا۔ اس لئے سائنس میں جزئی واقفیت ہی کی بنیاد پر تمام نظریات قائم کئے گئے ہیں۔ یہی سائنسی طریقہ وحی کے بارے میں بھی انسان کو اختیار کرنا چاہئے۔

قرآن خدا کا کلام ہے، وہ پیغمبر اسلام کا اپنا کلام نہیں۔ اس کا ایک سادہ ثبوت قرآن و حدیث کی زبان کا فرق ہے۔ حدیث خود پیغمبر اسلام کا اپنا کلام ہے اور قرآن وہ کلام ہے جس کو پیغمبر اسلام نے خدا کا کلام بتا کر پیش کیا۔ جب دونوں کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کی زبان اور قرآن کی زبان کے درمیان واضح اور نمایاں فرق ہے۔ حدیث اپنی تمام خوبیوں کے باوجود ایک "بشر" کی زبان معلوم ہوتی ہے۔ اس کے برعکس قرآن اپنے غیر معمولی اسلوب کی بنا پر ایک برتر شاہانہ کلام دکھائی دیتا ہے۔ حدیث کی زبان اور قرآن کی زبان کا یہ فرق اتنا زیادہ نمایاں ہے کہ کوئی بھی عربی داں جو دونوں کو تقابلی طور پر پڑھے، وہ اس فرق کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دونوں کا یہ فرق اپنے آپ میں اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے نہ کہ خود رسول کا کلام۔

دوسری چیز یہ کہ قرآن کے کلام میں معنوی اعتبار سے ایسے مختلف استثنائی پہلو ہیں جو کسی بھی انسان کے کلام میں پائے نہیں جاتے۔ ان میں سے ایک پہلو یہ ہے کہ قرآن میں فلکیات، طبیعیات، حیاتیات، ارضیات، نباتات، حیوانات، اور تاریخ، وغیرہ کے بارے میں ایسے بیانات ہیں جو ڈیڑھ ہزار سال پہلے کسی بھی انسان کو معلوم نہ تھے جب کہ قرآن نازل ہوا۔ یہ حقائق پہلی بار صرف انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں انسان کے علم میں آئے۔ ان حوالوں کا استثنائی طور پر قرآن میں موجود ہونا اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ قرآن خداوند عالم الغیب کا کلام ہے۔ کوئی انسان اس قسم کی پیشگی اطلاع پر قادر نہیں ہو سکتا۔

اس نوعیت کی بہت سی مثالیں راقم الحروف نے اپنی کتابوں میں درج کی ہیں۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو، عظمتِ قرآن، مذہب اور جدید چیلنج کا متعلق حصہ۔ اپنی تفسیر تذکیر القرآن میں

بھی بعض آیات کی تشریح کے تحت راقم الحروف نے اس طرح کے کچھ حوالے شامل کئے ہیں۔

فرانس کے ڈاکٹر مورس بکائی (Maurice Bucaille) نے خاص اسی موضوع پر ایک کتاب فرانسیسی زبان میں لکھی ہے۔ اس کا ترجمہ مختلف زبانوں میں ہوا ہے۔ عربی ترجمہ کا نام یہ ہے: القرآن الکریم والتوراۃ الانجیل والعلم (صفحات ۲۹۰) انگریزی ترجمہ کا ٹائٹل یہ ہے:

The Bible The Qur'an and Science.

اس کتاب میں قرآن کے قدیم بیانات کا تقابل جدید سائنسی دریافتوں سے کیا گیا ہے۔ مصنف نے لکھا ہے کہ دونوں کے درمیان استثنائی طور پر کامل مطابقت کی توجیہہ اس کے سوا کچھ اور نہیں کی جا سکتی کہ قرآن کو خدا کا کلام مانا جائے۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے مصنف نے آخر میں لکھا ہے کہ:

In view of the level of knowledge in Mohammad's day, it is inconceivable that many of the statements in the Qur'an which are connected with science could have been the work of a man. It is, moreover, perfectly legitimate, not only to regard the Qur'an as the expression of a Revelation but also to award it a very special place, on account of the guarantee of authenticity it provides and the presence in it of scientific statements which, when studied today, appear as a challenge to explanation in human terms.

جمع وتدوین

قرآن پرنٹنگ پریس سے پہلے کے زمانہ میں نازل ہوا۔ مگر اس کی حفاظت کے لئے غیر معمولی اہتمام کیا گیا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہر وقت کوئی نہ کوئی کاتب وحی رہتا تھا تاکہ جب بھی جبرئیل قرآن کا کوئی حصہ لے کر اتریں تو فوراً اس کو لکھ لیا جائے۔ یہ کتاب اس زمانے کے مستعمل کاغذوں پر ہوتی تھی۔ مثلاً جھلی وغیرہ۔ کتابت کا یہ اہتمام اتنا زیادہ تھا کہ ہجرت کے موقع پر پیغمبر اسلام اپنے صحابی ابو بکر صدیق کے ساتھ مکہ سے مدینہ کے لئے روانہ ہوئے تو اگرچہ یہ انتہائی ہنگامی سفر تھا لیکن اس کے باوجود حضرت ابو بکر صدیق جو ایک کاتب وحی بھی تھے،

اپنے ساتھ کاغذ اور قلم بھی لئے ہوئے تھے تاکہ سفر کے دوران اگر قرآن کا کوئی حصہ اترے تو اس کو فوراً لکھ لیا جائے۔

قرآن کو محفوظ کرنے کا یہ اہتمام بیک وقت دو طریقوں سے جاری تھا۔ ایک، نزول کے بعد فوراً اس کو لکھ لینا۔ دوسرے، اس کو باقاعدہ یاد کر لینا۔ اس طرح ایک طرف تقریباً دو درجن کاتب وحی کتابت کے عمل میں مصروف رہتے تھے۔ اور دوسری طرف ہزاروں کی تعداد میں آپ کے ایسے اصحاب تھے جو قرآن کو لفظ بلفظ یاد کر لیتے تھے۔ واضح ہو کہ دور پریس سے پہلے دنیا بھر میں چیزوں کو یاد رکھنے کا رواج تھا اس لئے کثرت استعمال کی بنا پر اس زمانہ کے لوگوں کے حافظے بہت اچھے ہوا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر قدیم عرب میں ایسے ہزاروں لوگ تھے جن کو لمبے لمبے نسب نامے اور بڑے بڑے قصیدے زبانی یاد تھے۔ اور وہ ان کو اپنے حافظہ کی مدد سے مجلسوں میں پڑھا کرتے تھے۔

اس طرح قرآن حسب موقع اترتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے کچھ پہلے مکمل ہو گیا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی آخر عمر میں جب کہ قرآن کے تمام حصے اتر چکے تھے، خدا کے حکم سے جبرئیلؑ آپ کے پاس آئے۔ انھوں نے قرآن کے تمام نازل شدہ حصوں کو موجودہ مصحف کے مطابق ترتیب دیا۔ اور پھر مکمل قرآن سورہ فاتحہ سے لے کر سورہ الناس تک سلسلہ وار پڑھ کر سنایا۔ اور پھر اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے قرآن کو سلسلہ وار پڑھ کر سنایا۔ اس طرح جبرئیلؑ کے سامنے مکمل طور پر پڑھنے کا واقعہ دو بار ہوا۔ پہلے کو عرضِ اولیٰ کہا جاتا ہے اور دوسری بار پڑھے جانے کو عرضہ اخیرہ۔

۶۳۲ء میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو اس وقت قرآن ہر اعتبار سے محفوظ اور مکمل ہو چکا تھا۔ البتہ وہ ایک مجلد کتاب کی صورت میں اب تک جمع نہیں ہوا تھا۔ یہ آخری کام خلیفۂ اول ابوبکر صدیق کی ہدایت کے تحت انجام پایا۔ خلیفۂ اول نے اس مقصد کے لئے زید بن ثابت انصاری کو مقرر کیا جو اس خاص کام کے لئے صحابہ میں سب سے زیادہ اہل سمجھے جاتے تھے۔

حضرت زید بن ثابت نے اس کام کے لئے وہ آخری اہتمام کیا جو کسی انسان کے لئے ممکن ہو سکتا تھا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ لوگوں کے پاس قرآن کے لکھے ہوئے جتنے اجزاء ہیں وہ سب کے سب لائے جائیں۔ چنانچہ سب کے سب کتابت شدہ اجزاء حضرت زید بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کے حوالے کر دئے گئے۔ وہ خود قرآن کے مکمل حافظ تھے۔ تاہم انہوں نے مزید احتیاط کے لئے کچھ اور حفاظ کو اپنی مدد کے لئے مقرر کیا۔

اب وہ عمل شروع ہوا جس کو ایک مستشرق نے بجا طور پر چیکنگ کا دہرا طریقہ (double checking system) کا نام دیا ہے۔ یعنی ایک طرف قاری قرآن کے حصے پڑھتا تھا اور دوسری طرف اس پڑھے ہوئے حصے کی مطابقت تحریری ذخیرہ سے کی جاتی تھی۔ اور جب تحریر اور حافظہ دونوں ایک دوسرے کے مطابق ثابت ہو جاتے تھے تو اس کو اس زمانہ کے دستیاب کاغذ پر لکھ لیا جاتا تھا۔ اس طرح دہرا چیکنگ کے اصول کو اختیار کرتے ہوئے پورے قرآن کو از اول تا آخر ترتیب کے ساتھ اس زمانہ کے قابل حصول کاغذ پر لکھا گیا۔ اور پھر اس کی سلائی کر کے اس کو ایک مجلد کتاب کی صورت دی گئی۔ چونکہ پہلا مصحف چوکور تھا اس لئے وہ ربعہ کہا جانے لگا۔

اس ربعہ (مصحفِ اول) کو خلیفہ ابو بکر صدیق نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ حضرت حفصہ بن عمر کے پاس رکھوا دیا۔ یہ مصحف اول اسی حالت میں حضرت حفصہ کے پاس محفوظ رہا۔ یہاں تک کہ تیسرے خلیفہ حضرت عثمان بن عفان کا زمانہ آیا۔ انھوں نے اس مصحفِ اول کو حضرت حفصہ کے پاس سے منگوایا اور سرکاری اہتمام کے تحت اس کی متعدد نقلیں تیار کرائیں۔ اور پھر ان تیار شدہ سرکاری نسخوں کو مسلم دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں بھیج دیا اور یہ حکم دیا کہ یہ مصاحف شہر کی جامع مسجدوں میں رکھے جائیں تاکہ لوگ اس سے استفادہ کر سکیں۔ اس کے بعد ہر شہر میں لوگ ان مصاحف کی مزید نقلیں تیار کرنے لگے۔ یہاں تک کہ قرآن کے ہزاروں صحیح نسخے ایشیاء سے لے کر افریقہ تک ہر ملک میں پھیل گئے۔

قرآن کی حفاظت اور اشاعت کی یہ تاریخ آگے بڑھتی رہی۔ اس میں مختلف پہلوؤں سے نسل در نسل لوگ حصہ لیتے رہے۔ مثال کے طور پر بنو امیہ کے حاکم حجاج بن یوسف الثقفی (وفات ۹۵ھ / ۷۱۴ء) کے زمانے تک قرآن میں اعراب نہیں ہوتا تھا۔ جس کی وجہ سے غیر عالم اس کو پڑھنے میں غلطی کرتے تھے۔ حجاج نے یہ کیا کہ پورے قرآن پر اعراب لگوائے۔ اس کے نتیجہ میں یہ امکان ختم ہو گیا کہ کوئی شخص قرآن کو پڑھنے میں ادائیگی کی غلطی کرے۔

اسی طرح قرآن کے قدیم نسخے ابتدائی خط میں لکھے جاتے تھے۔ اس خط کا اسلوب بالکل سادہ تھا۔ اس میں موجودہ تحریری حسن موجود نہ تھا۔ اس کمی کو عباسی دور کے خطاط ابن مقلہ (وفات ۹۴۰ء) نے پورا کیا۔ ابن مقلہ خطاطی کا خصوصی ذوق رکھتا تھا۔ اس نے لمبی مدت کے مشق اور تجربہ کے بعد وہ خوبصورت عربی خط ایجاد کیا جس کو خطِ کوفی کہا جاتا ہے۔ موجودہ عربی خط اسی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ اس طرح ابن مقلہ کی کوششوں نے قرآن کو حسن خط کے دور میں داخل کر دیا۔

قرآن کی حفاظت کا یہ عمل مسلسل صدیوں تک جاری رہا۔ کچھ لوگ کامل اہتمام کے ساتھ قرآن کی نقلیں تیار کرتے اور اسی طرح کچھ لوگ کامل اہتمام کے ساتھ قرآن کو حفظ کرتے۔ کتابت اور حفظ کو ایک دوسرے سے چیک کرنے کا عمل بھی صدیوں تک جاری رہا۔ جب بھی کوئی شخص قرآن کا ایک نسخہ لکھ کر تیار کرتا تو کسی مستند حافظ کو پڑھوا کر وہ اس کو چیک کرتا۔ اسی طرح جب کوئی شخص قرآن کا حفظ کرتا تو اس کے حفظ کو لکھے ہوئے قرآن سے چیک کیا جاتا۔ یہ عمل مسلسل جاری رہا۔ کچھ لوگوں نے فن قرأت ایجاد کیا۔ اس کے بعد ہر نسل میں ہزاروں لوگ اس عمل میں مشغول ہو گئے کہ وہ پیغمبر اور آپ کے اصحاب کے لہجہ اور قرأت کو اس کی سابقہ حالت میں محفوظ رکھیں۔

حفاظت قرأت کا یہ اہتمام اتنے بڑے پیمانہ پر ہوا کہ آج جب ایک تربیت یافتہ قاری قرآن کی تلاوت کرتا ہے تو سننے والوں کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ رسول اور اصحاب رسول

کی قرأت کو سن رہے ہیں۔ اس طرح رسول اور اصحاب رسول کی قرأت تاریخ کے دوش پر سوار ہو کر نسل در نسل سفر کرتی رہی تاکہ ہر زمانہ کے لوگوں کو اس کی گونج اپنی اصل آواز میں سنائی دیتی رہے۔

قرآن کی حفاظت کا یہ عمل نسل در نسل جاری رہا، یہاں تک کہ وہ پریس کے دور میں اور ریکارڈنگ کے دور میں پہنچ گیا۔ جس کے بعد کسی تبدیلی یا ضیاع کا کوئی سوال نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ قرآن کی انسانی حفاظت کے ساتھ اب اس کی پشت پر مشینی حفاظت کا اہتمام بھی شامل ہو گیا ہے۔ اس اہتمامِ مزید نے اب متنِ قرآن میں کسی بھی قسم کے بگاڑ کو عملاً ناممکن بنادیا ہے۔

عربی زبان

قرآن کی حفاظت کے ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ قرآن کی زبان عربی کو ہمیشہ کے لئے محفوظ رکھا جائے۔ یہ کام بھی امت کے علماء نے بہت بڑے پیمانہ پر انجام دیا۔ عربی زبان قرآن کے نزول کے وقت ہی ایک اعلیٰ زبان کی حیثیت رکھتی تھی تاہم فنی اعتبار سے اس کی تدوین نہیں ہوئی تھی۔ اس سلسلہ میں بہت لوگ اٹھے جنھوں نے نحو اور صرف اور لغت کے میدان میں غیر معمولی کام کیا۔ اور عربی زبان کو ایک مدون لغت کی حیثیت دے دی۔ قرآن کی زبان عربی کی حفاظت کا یہ کام اتنے بڑے پیمانہ پر ہوا کہ عربی زبان استثنائی طور پر آج بھی ابتدائی حالت میں زندہ ہے جس طرح وہ قرآن کے نزول کے وقت تھی۔ چودہ سو سال کی طویل مدت کے باوجود اس کے اندر کوئی لغوی تبدیلی نہ ہو سکی۔ جب کہ اس مدت میں دنیا کی تمام زبانیں بالکل بدل چکی ہیں۔

مثال کے طور پر جیفرے چاسر (Geoffrey Chaucer) انگریزی زبان کا مشہور شاعر ہے۔ چاسر ۱۳۴۲ء میں لندن میں پیدا ہوا اور ۱۴۰۰ء میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کا زمانہ آج سے پانچ سو سال پہلے کا ہے۔ لیکن اس کی زبان موجودہ انگریزی زبان سے اتنی زیادہ مختلف ہے کہ آج

کا کوئی عام انگریزی داں اس کو نہیں سمجھ سکتا۔ اس کو صرف ڈکشنری اور مخصوص ماہرین کی شرح کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے۔ مگر قرآن کی زبان عربی کا معاملہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ آج لکھی جانے والی عربی زبان عین وہی ہے جو نزول قرآن کے زمانہ میں تھی۔ قرآن اور حدیث اور صحابہ کی زبان کو سمجھنا آج کے ایک عربی داں کے لئے اتنا ہی آسان ہے جتنا آج سے چودہ سو سال پہلے کے ایک عربی داں کے لئے ممکن اور آسان تھا۔

عربی زبان کا اس طرح استثنائی طور پر اپنی اصل ابتدائی حالت پر باقی اور زندہ رہنا محض اتفاقاً نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہزاروں لوگ حفاظتِ زبان کے اس عمل میں لگے رہے۔ انھوں نے نحو اور صرف اور لغت اور دوسرے متعلق فنون میں غیر معمولی محنتیں کیں یہاں تک کہ ایک غیر مدون زبان کامل معنوں میں ایک مدون علمی زبان بن گئی۔ حفاظت قرآن کی یہ محنت کتنے بڑے پیمانہ پر کی گئی، اس کی صرف ایک مثال یہاں نقل کی جاتی ہے۔ ابو سعید الاصمعی ایک مشہور لغوی تھا۔ وہ ۱۲۲ھ میں بصرہ میں پیدا ہوا اور بصرہ ہی میں ۲۱۶ھ میں اس کی وفات ہوئی۔ الاصمعی کو اس بات کی دھن تھی کہ وہ عربی الفاظ کے وہ معانی دریافت کرے جو اصلی عرب باشندوں کے ذہن میں ہوتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے وہ لمبی مدت تک عرب کے صحراؤں میں گھومتا رہا تاکہ عرب بدوؤں سے عربی کے بارے میں لسانی معلومات حاصل کرے۔ کیوں کہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ عرب بدوؤں میں عربی زبان اپنی اصل حالت میں محفوظ ہے۔

قرآن کی ایک آیت کے الفاظ یہ ہیں: فدمدم علیھم ربھم بذنبھم فسواھا (الشمس ۱۴) الاصمعی کو یہ فکر ہوئی کہ خالص عرب کس خاص مفہوم اور کس خاص موقع پر "دمدم" کا لفظ بولتے ہیں۔ اس دھن میں وہ عرب کے ایک بدو قبیلہ کے پاس گیا۔ وہ ایسا کر سکتا تھا کہ کسی بدو سے پوچھتا کہ تم لوگ دمدم کا لفظ کس موقع پر بولتے ہو مگر اس نے اس پر قناعت نہیں کی۔ اس نے چاہا کہ کوئی ایسا موقع آئے جب کہ ایک بدو بے ساختہ طور پر دمدم کا لفظ بول پڑے۔ اس مقصد کے لئے وہ ایک خانہ بدوش بدو خاندان کے ساتھ شامل ہو گیا۔

تقریباً چھ مہینے گزر گئے لیکن بدو کی زبان سے دمدم کا لفظ اسے سنائی نہیں دیا۔ آخر کار ایک دن ایسا ہوا کہ ایک مقام پر خیمہ لگا ہوا تھا۔ اور وہاں دن کے کھانے کے لئے سالن پک رہا تھا۔ بدو مرد خیمے کے اندر تھا اور اس کی عورت باہر کچھ کام کر رہی تھی۔ الاصمعی بدو کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ سالن پکتے پکتے جب وہ لمحہ آیا کہ اس کی حرارت سو ڈگری پر پہنچ گئی اور برتن کے اوپر رکھا ہوا ڈھکن بھاپ کے جوش سے اچھل پڑا تو بدو نے اپنی بیوی کو اس کی خبر دیتے ہوئے کہا: دمدمت۔ یہ سنتے ہی الاصمعی خیمے سے نکل کر یہ کہتا ہوا بھاگا کہ:

والله وجدتُ والله وجدتُ، "خدا کی قسم میں پا گیا خدا کی قسم میں پا گیا۔"

اس طرح کئی سو سال تک ہزاروں اہل علم محنت کرتے رہے۔ وہ مختلف پہلوؤں سے عربی زبان کی حفاظت اور تدوین میں مصروف رہے۔ اس کا نتیجہ آج ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ جس طرح قرآن کامل طور پر محفوظ ہے اسی طرح اس کی زبان عربی بھی کامل طور پر محفوظ ہے۔ زبان و ادب کی تاریخ میں یہ ایک انتہائی نادر استثناء ہے، اس کی کوئی دوسری مثال تاریخ میں موجود نہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج قرآن کو سمجھنا عالم لوگوں کے لئے اسی طرح ناممکن ہو جاتا جس طرح دوسری مذہبی کتابوں کے ابتدائی نسخوں کو سمجھنا عام لوگوں کے لئے ناممکن ہو چکا ہے۔ دوسری تمام مذہبی کتابیں ترجموں کی مدد سے پڑھی جاتی ہیں۔ جب کہ قرآن کا مطالعہ اس کی اصل زبان میں کیا جاتا ہے۔

تفسیر قرآن

قرآن میں مختلف انداز سے یہ بات کہی گئی ہے کہ قرآن کے نزول کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اس پر غور کریں اور اس سے ہدایت حاصل کریں: کتب انزلنه الیك مبرك لیدبروا آیته ولیتذکر اولوا الالباب (ص ۲۹) یعنی یہ ایک بابرکت کتاب ہے جو ہم نے تمہاری طرف اتاری ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں پر غور کریں اور تاکہ عقل والے اس سے نصیحت حاصل کریں۔

قرآن کو پڑھنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک ہے سادہ طور پر اس کی قرأت کرنا۔ اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس کی آیتوں میں غور و فکر کر کے اس کو پڑھا جائے۔ قرآن کی قرأت سے ایک شخص کو اس کے سادہ معانی معلوم ہو جاتے ہیں۔ اور اس طرح قرآن کو سادہ طور پر سمجھنا بھی بلا شبہہ مفید ہے۔ لیکن قرآن کے گہرے معانی صرف اس وقت سمجھ میں آسکتے ہیں جب کہ اس کی آیتوں پر غور و فکر کیا جائے۔ ایک صحابی کے متعلق روایت میں آیا ہے کہ انھوں نے سورہ البقرہ کا مطالعہ غور و فکر کے ساتھ کیا تو اس میں انھیں تین سال کا وقت لگ گیا۔

قرآن کی سادہ قرأت کیا ہے، اس کو سمجھنا کوئی مشکل نہیں۔ ہر آدمی جو عربی زبان جانتا ہے وہ سادہ قرأت کے ذریعہ قرآن کے معانی کو سمجھ سکتا ہے اور جو شخص عربی زبان نہیں جانتا وہ اپنی معلوم زبان میں قرآن کا ترجمہ پڑھ کر اس کو سمجھ سکتا ہے۔

اس اعتبار سے قرآن ایک آسان کتاب ہے (القمر ۱۷) جس آدمی کے اندر نصیحت لینے کا ذہن ہو اور وہ نفسیاتی پیچیدگی میں مبتلا نہ ہو تو قرآن کی سادہ قرأت یا اس کا ترجمہ پڑھنا بھی اس کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔ وہ سادہ قرأت کے ذریعہ بھی ایسی تذکیری باتیں پالے گا جو اس کی زندگی کو سدھارنے والی ہوں اور اس کے لئے اسلامی زندگی گزارنے میں مددگار بن جائیں۔

لیکن قرآن میں تدبر کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ سادہ قرأت اور تدبر کے ساتھ قرأت کے فرق کو ایک حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: "انزل القرآن علی سبعة احرف، لکل آیة منها ظهر وبطن، ولك حد مطلع" (مشکاۃ المصابیح ۱/۲۳۸) قرآن سات حرفوں پر اتارا گیا۔ اس کی ہر آیت کا ایک ظاہر ہے اور ایک اس کا باطن ہے۔ اور ہر حد کا ایک مطلع ہے۔

مطلع عربی زبان میں دیکھنے یا جھانکنے کی جگہ کو کہتے ہیں اگر آپ زمین پر کھڑے ہو کر آس پاس کی چیزوں کو دیکھ رہے ہوں تو آپ کی حد نظر کم ہوگی اور آپ بہت تھوڑی چیزوں کو دیکھ پائیں گے۔ لیکن اگر آپ ایک ملٹی اسٹوری بلڈنگ کے اوپر کی چھت پر کھڑے ہوں تو بلند مطلع کی وجہ سے آپ کی حد نظر بہت بڑھ جائے گی۔ اور آپ زیادہ دور تک کی چیزوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں گے۔

اس حدیث میں مطلع کے فرق کی مثال سے بتایا گیا ہے کہ قرآن کو اس کے ظاہری الفاظ کے اعتبار سے پڑھنے میں اور اس کے معنی پر غور کر کے پڑھنے میں کیا فرق ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ جو آدمی صرف ظاہری الفاظ کے دائرے میں قرآن کو پڑھ رہا ہو وہ گویا نیچے کے مطلع سے قرآن کے مضامین کو دیکھ رہا ہے۔ ایسا آدمی قرآن کے صرف سادہ مفہوم تک پہنچ سکے گا۔ اس کے برعکس جو آدمی معانی پر غور کرتے ہوئے قرآن کو پڑھے وہ گویا بلند مطلع سے قرآن کے مضامین کو دیکھ رہا ہے۔ یہ دوسرا آدمی قرآن کی گہرائیوں تک پہنچ جائے گا۔ قرآن کے مطالعہ کی ان دو مختلف قسموں کو علمی زبان میں اس طرح بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ ان میں سے ایک قرآن کی سطور (lines) کا مطالعہ ہے اور دوسرا قرآن کی بین السطور (between the lines) کا مطالعہ۔ مطالعہ کی ان دونوں قسموں میں جو فرق ہے اس کو اہل علم بخوبی طور پر سمجھ سکتے ہیں۔

قرآن کے سطور کو پڑھنا اور قرآن کے بین السطور کا مطالعہ کرنا، دونوں میں جو فرق ہے اس کو یہاں مثال کے ذریعہ واضح کیا جاتا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ میں تھے تو وہاں ایسا ہوا کہ آپ کی مجلس میں بعض لوگ زور زور سے بولنے لگے۔ یہ اسلامی آداب کے خلاف تھا۔ چنانچہ قرآن میں اس کی ممانعت کے لئے یہ آیت اتری:

اے ایمان والو، تم اپنی آوازوں کو پیغمبر کی آواز سے اوپر مت کرو اور نہ اس کو اس طرح آواز دے کر پکارو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال حبط (برباد) ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔ جو لوگ اللہ کے رسول کے آگے اپنی آوازیں پست رکھتے ہیں وہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لئے جانچ لیا ہے۔ ان کے لئے معافی ہے اور بڑا ثواب ہے۔ جو لوگ تم کو حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں ان میں سے اکثر سمجھ نہیں رکھتے۔ اور اگر وہ صبر کرتے یہاں تک کہ تم خود ان کے پاس نکل کر آجاؤ تو یہ ان کے لئے بہتر ہوتا۔ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (الحجرات ۲-۵)

قرآن کی ان آیتوں کو جو آدمی سادہ طور پر محض الفاظ کی سطح پر پڑھے گا وہ اس کے ظاہری مفہوم کو لے کر اس سے صرف ذاتی تقدس کا مسئلہ نکالے گا۔ وہ سمجھے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بہت زیادہ مقدس تھی اس لئے جو لوگ آپ کی مجلسوں میں بیٹھتے تھے ان کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ تقدس اور احترام کے آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے آپ کے پاس بیٹھیں۔ ایسا آدمی صرف قدیم مدینہ کے کچھ لوگوں کو اس کا مخاطب سمجھے گا۔ خود اپنی ذات کے لئے یا دوسروں کے لئے اس کے نزدیک اس میں کوئی ہدایت نہ ہوگی۔

اس کے برعکس جو آدمی آیتوں پر غور کرے گا اور زیادہ گہرے معانی تک پہنچنے کی کوشش کرے گا وہ ان آیتوں میں ایک عمومی اور ابدی مسئلہ دریافت کرلے گا۔ وہ سمجھے گا کہ زمانۂ رسالت میں اگر اس کا تعلق ذاتِ رسول سے تھا تو اب اس کا تعلق پیغام رسول سے ہو گیا ہے۔ جس طرح پیغمبر اسلام کی زندگی میں آپ کی آواز پر آواز بلند کرنا جائز نہیں تھا، اسی طرح آج یہ جائز نہیں ہے کہ کوئی آدمی پیغمبر اسلام کی دی ہوئی تعلیمات کے خلاف غیر ضروری بحثیں نکالے اور ان کے مقابلہ میں سرکشی کا مظاہرہ کرے۔

ایسے آدمی کو آیتوں کا پورا مطالعہ بتائے گا کہ ان آیات میں جس حقیقت کی نشاندہی کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ آدمی کی ایک روش وہ ہے جو ایمان اور تقویٰ اور صبر کے مطابق ہے۔ اور دوسری روش وہ ہے جو نفاق اور بے خوفی اور بے صبری کی علامت ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ ہر لمحہ اپنا احتساب کرے۔ وہ اپنے اندر ایمان والی صفات پیدا کرنے کی کوشش کرے اور نفاق والی صفتوں سے اپنے آپ کو آخری حد تک بچائے۔

اس معاملہ کی دوسری مثال لیجئے۔ قرآن کی سورہ نمبر ۱۲ میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ بیان ہوا ہے۔ اس کا ایک جزء یہ ہے کہ قحط کے زمانہ میں حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی غلہ لینے کے لئے ان کے پاس مصر میں آئے۔ جب ان کو غلہ دیا جا چکا تو اس کے بعد ایک واقعہ ہوا جو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

پھر جب ان کا سامان تیار کرادیا تو اس نے پینے کا پیالہ (سقایہ) اپنے بھائی کے اسباب میں رکھ دیا۔ پھر ایک پکارنے والے نے پکارا کہ اے قافلہ والو، تم لوگ چور ہو، انھوں نے ان کی طرف متوجہ ہو کر کہا، تمہاری کیا چیز کھوئی گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم شاہی پیمانہ (صواع) نہیں پا رہے ہیں۔ اور جو اس کو لائے گا اس کے لئے ایک بار شتر غلہ ہے اور میں اس کا ذمہ دار ہوں۔ انھوں نے کہا، خدا کی قسم تم کو معلوم ہے کہ ہم اس ملک میں فساد کرنے کے لئے نہیں آئے اور نہ ہم کبھی چور تھے۔ انھوں نے کہا اگر تم جھوٹے نکلے تو اس چوری کرنے والے کی سزا کیا ہے۔ انھوں نے کہا، اس کی سزا یہ ہے کہ وہ جس شخص کے اسباب میں ملے پس وہی شخص اپنی سزا ہے۔ ہم لوگ ظالموں کو ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں۔ پھر اس نے اس کے (چھوٹے) بھائی سے پہلے ان کے تھیلوں کی تلاشی لینا شروع کی۔ پھر اس کے بھائی کے تھیلے سے اس کو برآمد کر لیا۔ اس طرح ہم نے یوسف کے لئے تدبیر کی۔ وہ بادشاہ کے قانون کی رو سے اپنے بھائی کو نہیں لے سکتا تھا مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ ہم جس کے درجے بلند کرنا چاہتے ہیں بلند کر دیتے ہیں اور ہر علم سے بالاتر ایک علم والا ہے (یوسف ۷۶)

ان آیتوں کو جو آدمی سادہ طور پر صرف الفاظ کی سطح پر پڑھے وہ اس کا مطلب یہ سمجھے گا کہ حضرت یوسف کے سوتیلے بھائیوں کے ساتھ جب ان کا سگا بھائی بن یامین آیا تو انھوں نے چاہا کہ اپنے بھائی کو اپنے پاس روک لیں۔ مگر وہ سوتیلے بھائیوں پر اپنی شخصیت ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے اس لئے حضرت یوسف نے اپنے چھوٹے بھائی کے سامان میں شاہی دربار کا ایک برتن رکھوا دیا۔ اور اس کے بعد درباریوں کو اس میں شریک کر کے بن یامین کو چوری میں پکڑوا کر اپنے پاس رکھ لیا۔ اس قسم کا معاملہ بلاشبہہ ایک پیغمبر کی شان کے خلاف ہے۔ لیکن جو آدمی صرف لفظی سطح پر قرآن کا مطالعہ کرے وہ ان آیتوں کا یہی مطلب لے گا۔ لیکن جو آدمی قرآن کی سطور سے گزر کر بین السطور تک پہنچنے کی کوشش کرے گا اور گہرائی میں اتر کر اس کا مفہوم جاننا چاہے گا وہ مذکورہ تفسیر کے برعکس ایک اور تفسیر تک پہنچ جائے گا جو پیغمبر کی شان کے عین مطابق ہے۔

ایسا آدمی جب قرآن کی ان آیتوں پر غور کرے گا تو اس کا ذہن ایک مقام پر پہنچ کر رک جائے گا۔ وہ دیکھے گا کہ شاہی دربار کے کارکن جو چیز تلاش کر رہے تھے وہ صواع (یوسف ۷۲) تھا جو عربی میں قاعدے کے مطابق مذکر ہے اور اس کے لئے ضمیر مذکر (ہٗ) آنا چاہئے۔ لیکن شاہی دربار کے کارکن جب اونٹوں کے سامان کی تلاشی لیتے ہیں تو سامان میں جو چیز ان کو ملتی ہے اس کے لئے قرآن میں مونث کی ضمیر (ھا) استعمال ہوئی ہے (۷۶)

اب غور کرنے والا آدمی جب ضمیر کے اس فرق کو دیکھے گا تو وہ پائے گا کہ معاملہ کی اصل تصویر اس سے بالکل مختلف ہے جو ظاہری الفاظ میں دکھائی دیتی ہے۔ اس سراغ کی روشنی میں جب وہ مزید غور کرے گا تو اس پر منکشف ہوگا کہ معاملہ کی اصل تصویر یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے چھوٹے بھائی کو پہچان کر اپنا پانی پینے کا پیالہ (سقایہ) از راہِ شفقت اس کے سامان میں رکھ دیا۔ سقایہ کا لفظ عربی قاعدے کے مطابق مؤنث ہے۔

دربار میں ناپ کے لئے ایک شاہی پیمانہ (صواع) تھا جو غالباً چاندی کا تھا۔ عربی قاعدے کے مطابق صواع کا لفظ مذکر ہے۔ اتفاق سے یہ صواع غلہ کے ڈھیر میں دب کر کہیں چھپ گیا۔ یعنی وہی واقعہ ہوا جس کو انگریزی میں مس پلیس (misplace) ہونا کہتے ہیں۔ قافلے کے جانے کے بعد جب دربار کے کارکنوں نے صواع کو نہیں دیکھا تو ان کو قافلہ والوں پر شبہہ ہوا جو ابھی ابھی دربار سے نکلے تھے۔ چنانچہ انھوں نے قافلہ والوں کو روک کر ان کے سامان کی تلاشی لی۔ اس تلاشی میں صواع تو ان کے سامان سے برآمد نہیں ہوا البتہ سقایہ (پینے کا پیالہ) برآمد ہو گیا۔ یہ بات اس طرح سے معلوم ہوتی ہے کہ تلاشی کے دوران جو چیز برآمد ہوئی اس کے لئے قرآن میں مونث کی ضمیر (ھا) آئی ہے۔ حالانکہ اگر صواع برآمد ہوتا تو اس کے لئے قرآن میں مذکر کی ضمیر (ہٗ) آنی چاہئے تھی۔

یہ سقایہ حضرت یوسف کے چھوٹے بھائی بن یامین کے سامان سے نکلا تھا کیوں کہ برادرانہ محبت کے تحت حضرت یوسف نے اس کو اپنے بھائی کے سامان میں رکھ دیا تھا۔ اب یہ ہوا

کہ دربار کے کارکنوں نے جب بن یامین کے سامان سے سقایہ نکالا تو انہوں نے بھائیوں سے کہا کہ تم نے اگرچہ صواع کی چوری تو نہیں کی ہے، لیکن تم نے ہمارے دربار کے ایک اور سامان سقایہ کو چرایا ہے اس لئے خود تمہارے قانون کے مطابق ہم تمہارے بھائی کو روک لیں گے اور اس کو تمہارے ساتھ جانے نہیں دیں گے۔ اس کے بعد وہ بن یامین کو اپنے ساتھ لائے اور ان کو حضرت یوسف کے حوالے کر دیا۔

قرآن فہمی کے لئے بہت سے علوم ضروری ہیں جن کا ذکر اہل تفسیر نے کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک قابل لحاظ بات یہ ہے کہ قرآن کے مطالعہ کے دو طریقے ہیں۔ ایک ہے فنی مطالعہ، اور دوسرا مطالعہ وہ ہے جو قرآن سے نصیحت لینے کے لئے کیا جائے۔ جہاں تک قرآن کے فنی مطالعہ کا تعلق ہے، اس کے سلسلہ میں بہت سے علوم کی ضرورت ہو سکتی ہے، حتی کہ ان علوم سے بھی زیادہ جن کا ذکر اہل تفسیر نے کیا ہے۔ اگر اس حدیث کو سامنے رکھا جائے: لا تنقضی عجائبه (قرآن کے عجائب کبھی ختم نہ ہوں گے) تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان علوم کی فہرست ہر دور میں بڑھتی رہے گی اور وہ کبھی ختم نہ ہوگی۔

مگر جہاں تک نصیحت کے مقصد سے قرآن کے مطالعہ کا تعلق ہے اس کے لئے عربی زبان سے واقفیت کے بعد سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ تقویٰ اور خشیت ہے۔ اس کی تصدیق خود قرآن سے ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اتقوا الله ویعلمکم الله۔ حقیقت یہ ہے کہ تقویٰ خود علوم ربانی کا ایک عظیم سرچشمہ ہے۔ اگر آدمی کے اندر گہرا تقویٰ موجود ہو تو قرآن کے معانی کو سمجھنے میں وہ اپنے آپ آدمی کے لئے رہنما بن جائے گا۔

ایک خط

برادر محترم جناب جسٹس قاضی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

برادرم جناب عبدالسلام اکبانی صاحب نے ٹیلی فون پر یہ خبر دی کہ ۲۶ مارچ ۲۰۰۰ کو آپ کی صاحبزادی کا بمبئی میں انتقال ہو گیا۔ آپ کے اس غم میں میں پوری طرح شریک ہوں اور یہ امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس دعا کو مرحومہ کے حق میں واقعہ بنائے جو قرآن میں ایک نیک بخت خاتون کی زبان سے ان الفاظ میں آئی ہے: رب ابن لی عندك بيتاً فی الجنة (التحریم ۱۱)

موت کے موقع پر مسلمان کی زبان سے یہ الفاظ نکلتے ہیں: انا لله و انا اليه راجعون (البقرہ ۱۵۶) اس قرآنی آیت کا مطلب، دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ ہر انسان جو اس دنیا میں آتا ہے اس کے پاس لازمی طور پر ایک ریٹرن ٹکٹ ہوتا ہے۔ ایک مقرر تاریخ کو بہر حال اس کو اس دنیا سے نکل کر آخرت کی دنیا میں چلے جانا ہے۔ موت کا ہر واقعہ گویا قدرت کے اس قانون کی یاد دہانی ہے۔ آدمی اگر اس حقیقت کو یاد رکھے تو اس کی پوری زندگی بدل جائے۔ وہ مکمل طور پر آخرت رخی زندگی (Akhirat- oriented life) گزارنے لگے۔

اس حادثہ کی خبر سن کر مجھے ایک حدیث یاد آئی جو صحیح مسلم میں ان الفاظ میں آئی ہے: عجباً لأمر المؤمن ! إنّ امره كله له خير، وليس ذلك لاحد الا للمؤمن، إن اصابته سراءُ شكرَ فكان خيراً له، وإن اصابته ضراءُ صبرَ فكان خيراً له (مومن کا معاملہ عجیب ہے۔ اس کے لئے اس کے ہر معاملہ میں بھلائی ہے۔ اور یہ مومن کے سوا کسی اور کے لئے نہیں۔ اگر اس کو کوئی خوشی ملتی ہے تو وہ شکر کرتا ہے پھر وہ اس کے لئے بھلائی بن جاتا ہے۔ اور اگر اس کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ صبر کرتا ہے پھر وہ اس کے لئے بھلائی بن جاتا ہے)۔

غیر مومنانہ روش یہ ہے کہ اگر کسی آدمی کو خوشی ملے تو وہ اس پر فخر کرے۔ اور اگر اس کو تکلیف پہنچے تو وہ مایوسی کا شکار ہو جائے۔ یہ دونوں حالتیں یکساں طور پر برائی کی حالتیں ہیں۔ اس

کے برعکس مومنانہ روش یہ ہے کہ آدمی کو خوشی ملے تو اس کا سینہ شکر کے جذبہ سے بھر جائے۔ اور اگر اس کو تکلیف کا تجربہ ہو تو وہ اس کو اللہ کا فیصلہ سمجھ کر اس پر راضی رہے۔ اور یہ دونوں حالتیں بلاشبہہ بھلائی کی حالتیں ہیں۔

اسلام میں جنازہ کی نماز کے لئے جو دعا سکھائی گئی ہے وہ اس کی ایک مثال ہے۔ چنانچہ بچی کے انتقال پر اس کی نماز جنازہ میں جو دعا پڑھی جاتی ہے، اس کا ایک جزء یہ ہے: اللھم اجعلھا لی عندك ذخراً (الترمذی، کتاب الدعوات) یعنی اے اللہ تو اس کو میرے لئے اپنے پاس ذخیرہ بنادے۔

یہ سادہ طور پر ایک دعا نہیں بلکہ وہ ایک خوش خبری ہے۔ یہ گویا اس فیصلۂ الٰہی کا اعلان ہے کہ کسی مومن کا بچہ یا بچی کم عمری میں وفات پاجائے اور وہ اس پر مطلوب صابرانہ رسپانس دے تو اس کا بچہ خدا کے پاس ذخیرہ (store) رہتا ہے اور آخرت میں پہنچ کر وہ ماں باپ کو زیادہ بہتر حالت میں مل جاتا ہے۔

خدا کا یہ قانون آدمی کے لئے کتنا تسکین بخش تصور ہے۔ موجودہ دنیا میں ہر آدمی کسی نہ کسی اعتبار سے کھونے کا تجربہ کرتا ہے۔ اس دنیا میں ہر یافت کے ساتھ ایک محرومی لگی ہوئی ہے۔ جس طرح گلاب کے درخت میں پھول کے ساتھ کانٹے ہوتے ہیں اسی طرح انسانی زندگی میں یہاں ہر آدمی کے لئے آرام کے ساتھ تکلیف اور خوشی کے ساتھ غم بھی لگا ہوا ہے۔ عام آدمی کے لئے اس دنیا میں غم کا تجربہ صرف غم کا تجربہ ہے۔ مگر وہ انسان جس کے اندر ایمانی شعور بیدار ہو چکا ہے وہ اپنی ربانی فکر کی بنا پر ہر نہیں میں ہے کا راز پالیتا ہے۔ وہ اپنی محرومی کو ہر بار ایک نئی یافت میں تبدیل کرلیتا ہے۔

یہ ایک قسم کے تحول یا تبدیلی کا معاملہ ہے۔ مومن اپنے غم کو دنیا میں صبر میں بدلتا ہے اور خدا اس کے صبر کو آخرت میں جنت کی صورت میں بدل دے گا۔ کتنے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو آخرت میں اس انعام کے مستحق ٹھہریں۔

۳ اپریل ۲۰۰۰ دعاگو وحیدالدین

سوال

قرآن کی آیت ھدیً للمتقین (۲:۲) میں لفظ متقین اپنے اصطلاحی معنی میں ہے یا لغوی معنی میں۔ اصطلاحی معنی میں لیں تو اس کا مطلب تو یہ ہوتا ہے کہ قرآن متقین بالفاظ دیگر مسلمین کے لئے تو ہدایت ہے، وہ غیر مسلمین کے لئے ہدایت نہیں اور اگر لغوی معنی میں لیں تو اگلی آیتوں میں متقین کی جو تعریف بیان کی ہے کہ وہ لوگ ایمان بالغیب رکھتے ہیں۔ نماز ادا کرتے ہیں یہ تعریفات غیر مسلمین پر کیسے صادق آسکتی ہیں۔ کیا ایمان بالغیب اور اقامۃ صلوۃ اور انفاق کو بھی لغوی معنی میں لیکر اس مشکل کو حل کیا جاسکتا ہے۔ (ابرار احمد رفعت، سورت)

جواب

قرآن عام طرز کی ایک مجرد تصنیف نہیں۔ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس کے مختلف اجزاء حالات کی نسبت سے نازل ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ تقریباً ۲۳ سال میں اس کی تکمیل ہوئی۔ قرآن فہمی کے سلسلہ میں یہ ایک بے حد اہم نکتہ ہے۔ اس بنا پر ایسا ہے کہ قرآن کی ہر آیت کا ایک مصداق خاص ہے جو سبب نزول کے اعتبار سے ہے۔ اور دوسرا اس کا مصداق عام، جو آیت کے توسیعی انطباق سے تعلق رکھتا ہے۔

اس کی ایک مثال سورہ النور کی یہ آیت ہے۔ والذی تولیٰ کبرہ منھم (النور ۱۱) سبب نزول کے اعتبار سے اس آیت کا ابتدائی مصداق قدیم مدینہ کا عبد اللہ بن ابی تھا۔ اور آیت کے توسیعی انطباق کے اعتبار سے اس میں ہر وہ آدمی شامل سمجھا جائے گا جو کسی کو بدنام کرنے کے لئے ابن ابی جیسا پست کردار ادا کرے، خواہ وہ کسی بھی زمانے سے تعلق رکھتا ہو۔

اب سورہ البقرہ کی ابتدائی آیتوں کو لیجئے۔ اس کی آیت نمبر ایک سے لے کر آیت نمبر ۷ تک کا خطاب رسول اللہ کے معاصر یہود سے ہے۔ اس کے بعد آیت نمبر ۸ سے لے کر آیت نمبر ۲۰ تک کا تعلق قدیم مدینہ کے منافقین سے ہے۔ اس کے بعد آیت نمبر ۲۱ سے لے کر آیت نمبر ۲۴ تک عام انسانیت سے خطاب کیا گیا ہے۔ اس کے بعد آیت نمبر ۲۵ سے اہل ایمان کا تذکرہ

شروع ہوتا ہے۔ سبب نزول کے اعتبار سے ان میں سے ہر آیت کا کوئی وقتی مصداق ہو سکتا ہے مگر اسی کے ساتھ ہر آیت کا ایک توسیعی انطباق بھی ہے جو ہر دور کے انسانوں سے تعلق رکھتا ہے۔

ذالک الکتاب میں الف، لام عہد کا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ وہی معہود کتاب ہے اس میں کوئی شک نہیں۔ یہود و نصاریٰ پر جو آسمانی کتابیں بھیجی گئیں ان میں ایک آخری آسمانی کتاب کی بشارت موجود تھی۔ قرآن وہی آخری اور محفوظ کتاب ہے۔ مگر اس سے ہدایت اسی کو ملے گی جو اس کی ضروری شرطوں کو پورا کرے۔

مدینہ میں اس وقت جو یہود آباد تھے وہ اپنے آپ کو اپنے نبیوں کی تعلیمات کا حامل بتاتے تھے۔ ان کے یہاں ایمان، نماز، زکوٰۃ وغیرہ کا وجود بھی پایا جاتا تھا۔ مگر ان کے یہاں اس کی اصل روح غائب ہو چکی تھی۔ فرمایا کہ قرآن اگرچہ سراپا کتاب ہدایت ہے مگر اس کے ذریعہ صرف اس شخص کو ہدایت ملے گی جس کے اندر حقیقی معنوں میں متقیانہ مزاج پایا جاتا ہو۔ الذین یؤمنون بالغیب جو غیبی حقیقتوں کو ماننے کے لئے تیار ہو، جس کے اندر عبادت الٰہی کی روح موجود ہو، نمائشی راستے کے بجائے اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو، جو اپنی مذہبی عصبیت میں مبتلا نہ ہو۔ جو لوگ اس قسم کی صفات رکھتے ہوں وہ بہت جلد قرآن اور صاحب قرآن کو پہچان لیں گے اور اس سے ہدایت حاصل کریں گے۔

اس کے بعد ان آیتوں کا ایک عمومی اور توسیعی پہلو ہے۔ اس اعتبار سے اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن اپنی ذات میں بلاشبہہ ہدایت ہے مگر اس دنیا میں کسی کتاب سے ہدایت لینے کے لئے ضروری ہے کہ ہدایت لینے والا ذہنی طور پر اس کے لئے تیار ہو۔

متقی کا اصلی اور لغوی مفہوم محتاط (cautious) ہے۔ انسان کی یہی صفت ہے جو اس کو حق کے معاملہ میں سنجیدہ بناتی ہے اور وہ اس کا سچا متلاشی بن جاتا ہے۔ اسی طرح ایمان کی اصل معرفت ہے اور معرفت صرف اس کو ملتی ہے جو دلیل سے ثابت ہو جانے کے بعد اس کو مان لینے کا مزاج رکھتا ہو۔ صلاۃ کی شرط سے مراد یہ ہے کہ آدمی کے اندر تسلیم و رضا (submission) کی

صفت موجود ہو۔ زکوٰۃ کی اصل حقیقت اپنی ذات میں دوسرے کا حق تسلیم کرنا ہے۔ ہر منزل کتاب پر ایمان لانے کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی گروہی تعصبات سے پاک ہو، وہ اپنے مانوس اکابر کے باہر ظہور میں آنے والے داعیانِ حق کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

مصداقِ عام کے اعتبار سے یہ پانچ بنیادی صفتیں ہیں، یہ صفتیں ہر انسان کی فطرت میں پیدائشی طور پر موجود ہوتی ہیں۔ جو شخص اپنی فطری صلاحیتوں کو زندہ رکھے وہ گویا قرآن سے ہدایت لینے کے لئے ایک تیار ذہن (prepared mind) ہے۔ جب بھی وہ کھلے ذہن کے ساتھ قرآن کو پڑھے گا تو وہ اس کے لئے معرفت حق کا ذریعہ بن جائے گا اور اس کا وہی حال ہوگا جس کا ذکر قرآن کی سورہ المائدہ آیت نمبر ۸۳ میں کیا گیا ہے۔

سوال

انٹرنیٹ پر جو سوالات ہم کو موصول ہوتے ہیں ان کا جواب عام طور پر انٹرنٹ کے ذریعہ دیا جاتا ہے۔ انٹرنٹ کے ذریعہ موصول شدہ ایک عمومی سوال یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمان مختلف مقامات پر جو جہاد کر رہے ہیں مغربی میڈیا اس کو فنا ٹسزم کہہ کر بدنام کر رہا ہے۔ مگر یہ درست نہیں۔ مسلمانوں کی لڑائی عدل (justice) کے حصول کے لئے ہے۔ جب مسلمانوں کو عدل نہ ملے تو ان کے لئے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہوتا کہ وہ لڑ کر عدل کو حاصل کریں۔ اگر ان کی لڑائی سے امن برہم ہوتا ہے تو اس کی ذمہ داری دوسروں پر ہے نہ کہ مسلمانوں پر۔ ان کا پتہ یہ ہے:

Mahmood H. M. Daya, P.O. Box 14757, Arusha, Tanzania.

جواب

عدل کے حصول کا کوئی تعلق جنگ سے نہیں۔ عدل جب بھی کسی کو ملتا ہے، پر امن تعمیری جدو جہد کے ذریعہ ملتا ہے نہ کہ متشددانہ جنگ کے ذریعہ۔ جنگ کے ذریعہ عدل حاصل کرنے کی کوشش ایسی ہی ہے جیسے معاش کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے کوئی شخص خودکشی کر لے۔

اسلام کے دور اول میں اہل اسلام کے ساتھ سب سے بڑی بے انصافی یہ تھی کہ ان کو مسجد

حرام تک پہنچنے سے روک دیا گیا تھا۔ مگر اس بے انصافی کو ختم کرنے کے لئے رسول اللہ نے جنگ نہیں کی بلکہ صلح اور امن کا معاہدہ کر لیا۔ صلح کے نتیجہ میں وہ پر امن حالات ملے جس میں استحکام کی کوشش کی جاسکے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ پر امن کوششوں کے ذریعہ اسلام اتنا مستحکم ہو گیا کہ کسی لڑائی کے بغیر مسجد حرام اور مکہ اہل اسلام کے قبضہ میں آگیا۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان اگر یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے تو انھیں جاننا چاہئے کہ اس ناانصافی کا اصل سبب خود مسلمانوں کا داخلی ضعف ہے۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ امن کے حالات پیدا کر کے وہ تعمیری عمل کریں جس سے ان کی داخلی کمزوریاں دور ہو جائیں۔ اس کے بعد اپنے آپ انھیں انصاف مل جائے گا۔

سوال

میں الرسالہ کا قاری ہوں۔ فطرت کے تمام قوانین کو ایک جملہ میں جاننا چاہتا ہوں تاکہ زندگی کے ہر معاملہ میں اس جملہ کو بنیادی نقطۂ نظر بنا سکوں۔ (سید عبد الحفیظ، جلگاؤں)

جواب

فطرت کے قوانین کا خلاصہ ایک لفظ میں یہ ہے ـــــ حقیقت پسندی۔ عام طور پر لوگوں کی سوچ یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ میرے موافق ہے وہ درست ہے۔ اور جو میرے خلاف ہے وہ نادرست۔ مگر صحیح بات یہ ہے کہ جو حقیقت واقعہ ہو اس کو صحیح اور درست مانا جائے۔ اس دنیا میں جب بھی کوئی شخص ناکام ہوتا ہے تو وہ قوانین فطرت کی خلاف ورزی کرنے کی بنا پر ناکام ہوتا ہے، خواہ وہ بطور خود دوسروں کی سازش کو اس کا ذمہ دار بتاتا رہے۔

سوال

دہلی کے ایک ہفتہ وار ہندی اخبار پنچ جنیہ کے حوالہ سے آپ کے خلاف کچھ باتیں اردو اخبارات و رسائل میں چھپی ہیں۔ مثلاً ماہنامہ البلاغ (بمبئی) کے شمارہ فروری ۱۹۹۹ میں یہ چھپا ہے کہ مولانا وحید الدین خاں نے فرمایا کہ "قرآن مجید میں لگ بھگ ۱۰۰ دوسری زبانوں کے الفاظ ہیں

جن میں سنسکرت خاص ہے اور یہ کہ محمد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو جن چار زبانوں پر عبور حاصل تھا ان میں سنسکرت بھی ایک تھی۔" (صفحہ ۴۶) اس طرح کی باتیں اور بھی کئی پرچوں میں چھپی ہیں۔ مثلاً دہلی کے روزنامہ قومی آواز کے شمارہ ۹ جنوری ۱۹۹۹ میں مراسلہ کے کالم میں آپ کی ایک تقریر کے حوالہ سے آپ کی طرف یہ الفاظ منسوب کئے گئے ہیں کہ "قرآن کریم میں ایک سو الفاظ غیر عربی کے شامل ہیں جن میں بڑی تعداد سنسکرت کے الفاظ کی ہے اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم چار زبانوں کے عالم تھے جن میں سے ایک سنسکرت زبان ہے۔" (صفحہ ۳) یہ بڑی عجیب باتیں ہیں۔ ان کو لے کر کچھ مسلم اخبارات و رسائل میں آپ کے خلاف سخت باتیں چھپی ہیں۔ براہِ کرم بتائیں کہ اس معاملہ کی حقیقت کیا ہے (عبدالرحمٰن، نئی دہلی)

جواب

یہ سب بے بنیاد باتیں ہیں جو غیر ذمہ دارانہ صحافت کی پیداوار ہیں۔ اس صحافت کا شکار ہر وہ شخص ہو تا رہا ہے جو "نیوز" میں آجائے۔ چنانچہ میرے خلاف بھی کچھ مسلم اخبارات و رسائل میں ایسے خطوط اور مضامین چھپتے رہے ہیں جو سراسر لغو اور بے بنیاد ہیں۔ میں ان کے بارے میں عام طور پر خاموشی کا رویہ اختیار کرتا ہوں اور مراسلہ نگاروں کے حق میں دعائے خیر کرتا ہوں۔ اس سے پہلے ایک بار قومی آواز میں میرے خلاف ایک بے بنیاد بات چھپی۔ اس کی تردید میں میں نے ایک مراسلہ بھیجا جو قومی آواز (۵ مارچ ۱۹۹۵) میں چھپا۔ میرے جوابی مراسلہ کو دیکھ کر تبلیغی جماعت کے معروف بزرگ مولانا اظہار الحسن صاحب مرحوم نے مجھے ایک خط لکھا۔ اس میں مجھے خاموشی کے اصول پر برقرار رہنے کی نصیحت کرتے ہوئے انھوں نے یہ شعر درج کیا تھا:

اشارتاً بھی نہ قصے بیاں کئے ہوتے سئے تھے ہونٹ تو آنسو بھی پی لئے ہوتے

سوال

آج کل دستور ہند میں تبدیلی کی بحث چھڑی ہوئی ہے۔ کوئی تبدیلی کی موافقت میں رائے دیتا ہے اور کوئی اس کی مخالفت میں۔ اس معاملہ میں آپ کی رائے کیا ہے،

براہ کرم مطلع فرمائیں۔ (ودود ساجد، نئی دہلی)

جواب

دستور ہند میں تبدیلی کی بحث میں ایک رائے یہ سامنے آرہی ہے کہ دستور میں تبدیلی ہونی چاہئے۔ اور دوسری رائے یہ ہے کہ دستور میں تبدیلی نہیں ہونی چاہئے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہاں ایک تیسری رائے کا بھی امکان ہے۔ اور وہ یہ کہ دستور ہند میں تبدیلی بے فائدہ ہے۔

اس سلسلہ میں پہلا سوال یہ ہے کہ دستور ہند میں تبدیلی کیوں؟ ۱۹۴۷ کے بعد جب یہ دستور بنا تو اس وقت ملک کے انتہائی اعلیٰ ذہن دستور ساز اسمبلی کے ممبر تھے۔ انھوں نے لمبی بحث اور گفتگو کے بعد یہ دستور بنایا۔ اب کیا ان سے زیادہ بہتر دماغ ہمیں حاصل ہو گئے ہیں جو اس سے اچھا دستور بنا سکیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی شخص ایسا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ پھر تبدیلی کس لئے۔

دوسری بات یہ کہ دستور میں تبدیلی ہمارے قومی مسائل کا حل ہے، اس کا دعویٰ کرنا بھی مشکل ہے۔ اس لئے کہ اگر دستور کی ترمیم سے مسئلہ حل ہوتا ہو تو اب تک اس کو حل ہو جانا چاہئے تھا، کیوں کہ پچھلے پچاس سال کے دوران اس میں ستر بار سے زیادہ ترمیمات ہو چکی ہیں۔ اس کے باوجود کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا۔ پھر ایک اور ترمیم سے یہ مسئلہ کیسے حل ہو جائے گا۔

تیسری صورت ترمیم برائے ترمیم کی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اور بھی زیادہ بے معنی ہے۔ کوئی بھی شخص یہ کہنے کی جرأت نہیں کرے گا کہ ترمیم ایک مسلسل عمل ہے جس کو ہر حال میں جاری رہنا چاہئے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت اصل سوال یہ نہیں ہے کہ دستور میں ترمیم کی ضرورت ہے بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ ترمیم کے باوجود یہ ضرورت کیوں باقی ہے۔ کیوں ایسا ہے کہ ترمیم کے باوجود ہمارے مسائل حل نہیں ہوئے۔ اس کا جواب صرف ایک ہے اور وہ ہے تعلیم میں ملک کا پچھڑا پن۔ تعلیم انسان کو باشعور بناتی ہے۔ اور اس کے اندر اصلاح کی قبولیت پیدا کرتی ہے۔ جب تک یہ ابتدائی کام نہ ہو، کوئی دوسری تدبیر ہمارے مسائل کو حل کرنے والی نہیں۔

۱۔ فروری ۲۰۰۰ میں نئی دہلی میں بڑے پیمانہ پر کتابوں کی نمائش (ورلڈ بک فئر) منعقد ہوئی۔ اس موقع پر الرسالہ مشن کا بک اسٹال بھی لگایا گیا۔ کافی لوگوں نے کتابیں دیکھیں اور حاصل کیں۔ بک اسٹال پر آنے والوں اور کتاب حاصل کرنے والوں میں مشہور سائنس داں ڈاکٹر عبدالکلام بھی تھے۔

۲۔ یونائیٹڈ ریلجس انی شیٹیو (United Religious Initiative) کی طرف سے ۱۱ مارچ ۲۰۰۰ کو انڈیا انٹر نیشنل سنٹر (نئی دہلی) میں انٹر فیتھ ڈائیلاگ ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور مذکورہ موضوع پر ایک تقریر کی۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ مذہبی ہم آہنگی کا ذریعہ یہ نہیں کہ تمام مذہبوں کو ایک مان لیا جائے۔ بلکہ اس کا ذریعہ یہ ہے کہ لوگوں میں باہمی احترام کا جذبہ پیدا کیا جائے۔

۳۔ قاہرہ کے عربی جریدہ الجمہوریہ کے فارن افئرس رپورٹر السید ھانی نے ۱۶ مارچ ۲۰۰۰ کو دہلی میں صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق ہندستانی مسلمانوں کے معاملات و مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مسائل کا تعلق انڈیا سے نہیں۔ وہ فطرت کا حصہ ہیں۔ چنانچہ یہ مسائل ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ مگر ان مسائل کے باوجود انڈیا میں مسلمانوں کے لئے عمل کے غیر معمولی مواقع ہیں۔ ان مواقع کو استعمال کر کے مسلمان ہر شعبہ میں ترقی کر رہے ہیں۔ ۱۹۴۷ میں مسلمانوں کی جو حالت تھی اس کے مقابلہ میں آج مسلمانوں کی حالت ہر اعتبار سے ۱۰۰ گنا زیادہ بہتر ہے۔

۴۔ ڈائرکٹوریٹ آف فیلڈ پبلسٹی (منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ، نئی دہلی) کے تحت ۱۴ مارچ ۲۰۰۰ کو ایک اجتماع ہوا۔ اس میں ڈائرکٹوریٹ کے تمام لوگ تقریباً ایک سو کی تعداد میں شریک ہوئے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور نیشنل انٹگریشن کے موضوع پر ایک تقریر کی۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اس دنیا میں فطرت

کا ایک نظام ہے اور اس نظام کی پیروی کر کے ہی یہاں کوئی کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے۔

۵۔ آندھرا پردیش کا سفر نامہ ماہ مئی کے شمارہ میں چھپ چکا ہے۔ خصوصی اہمیت کی بنا پر اس کو مزید علیحدہ کتاب کی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ اس کا نام مشاہدات دکن ہے۔ جو لوگ اس کو منگانا چاہیں وہ اس سلسلہ میں دفتر سے خط و کتابت کریں۔

۶۔ معلوم ہوا ہے کہ ساؤتھ افریقہ کے بعض دینی مدارس میں مذہب اور جدید چیلنج کا انگریزی ایڈیشن گاڈ ارائزز باقاعدہ نصاب میں داخل ہے۔ واضح ہو کہ ان مدارس میں انگریزی زبان ذریعہ تعلیم ہے۔ یہاں کے طلبہ پہلے اپنی درسیات کے تحت گاڈ ارائزز پڑھتے ہیں۔ اس کے بعد وہ الرسالہ (انگریزی) اور دوسری مطبوعات کو حاصل کرتے ہیں اور الرسالہ مشن کا زیادہ تفصیلی مطالعہ کرتے ہیں۔ اس طرح کی خبریں بعض دوسرے بیرونی ملکوں سے بھی ملی ہیں۔

۷۔ تین کتابوں کا ایک سٹ تیار ہو رہا ہے۔ ان کے نام یہ ہیں: مطالعۂ قرآن، مطالعۂ حدیث، مطالعۂ سیرت۔ ان میں سے مطالعۂ سیرت چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔ مطالعۂ قرآن لکھی جاچکی ہے، اور زیر طبع ہے۔ مطالعۂ حدیث کی ترتیب کا کام شروع ہو گیا ہے۔ یہ تیسری کتاب نسبتاً زیادہ ضخیم کتاب ہو گی۔

۸۔ الرسالہ مشن کی انگریزی کتابوں کی مانگ مختلف ملکوں میں کافی بڑھی ہے۔ لوگوں کے تقاضہ کے تحت آج کل مطالعۂ سیرت کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا جارہا ہے۔ جلد ہی انشاء اللہ مکمل ہو کر شائع ہو گا۔

۹۔ خبر نامہ کے تحت زیادہ تر مرکز دہلی کی خبریں آتی ہیں۔ حالانکہ ملک کے اندر اور ملک کے باہر بہت سے مقامات پر الرسالہ مشن سے وابستہ افراد اس کام میں مشغول ہیں۔ گزارش ہے کہ دوسرے مقامات کے لوگ اپنی سرگرمیوں کے بارے میں تحریر فرمائیں تاکہ انھیں خبر نامہ میں شامل کیا جاسکے۔

۱۰۔ الرسالہ مشن سے وابستہ لوگ جگہ جگہ اسکول اور مدرسے قائم کر رہے ہیں۔ یہ بہت خوش آئند بات ہے۔ لوگوں کو ہر جگہ اس قسم کے تعلیمی ادارے قائم کرنا چاہئے۔ یہ ایک بنیادی کام ہے اور دور رس نتائج کا حامل ہے۔

۱۱۔ ڈائری کی مزید کئی جلدیں کتابت ہو کر تیار ہیں۔ انشاء اللہ جلد ہی شائع کی جائیں گی۔ ان میں سے ہر جلد دو سال کی ڈائری پر مشتمل ہوگی۔ ڈائری کا یہ سلسلہ ۱۹۸۳ سے شروع ہوا اور اس کے بعد خدا کے فضل سے یہ مسلسل جاری ہے۔

۱۲۔ الرسالہ اور مطبوعاتِ الرسالہ کے قارئین خدا کے فضل سے دنیا کے ہر حصہ میں پائے جاتے ہیں۔ ان قارئین کے تاثرات ڈاک، ٹیلیفون، فیکس اور انٹرنیٹ کے ذریعہ برابر ملتے رہتے ہیں۔ مگر طوالت کے خوف سے ان کو خبر نامہ میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ پاکستان میں الرسالہ کے افکار تیزی سے پھیل رہے ہیں۔ یہاں ایک خط بطور نمونہ نقل کیا جاتا ہے۔ ایک پاکستانی نوجوان اپنے خط مورخہ ۲۵ مارچ ۲۰۰۰ میں لکھتے ہیں: ہم چند نوجوان ایک گاؤں میں رہتے ہیں اور آپ کا الرسالہ اور دیگر کتابیں تقریباً دس سال سے پڑھ رہے ہیں۔ اور آپ کے فکر سے کافی متاثر ہیں۔ ہم آپ کے بہت شکر گذار ہیں اور رب تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ وہ آپ کو صحت مند اور توانا رکھے، آمین۔ اس سے پہلے بھی ہم نے آپ کو چار پانچ خط لکھے ہیں جن میں سے آپ نے پہلے خط کا جواب بھی لکھا تھا۔ بعد میں آپ کا کوئی خط نہ ملا۔ شاید ہم نوجوان کچھ جذباتی ہیں۔ کیا کریں آپ سے والہانہ محبت اور عقیدت ہے۔ الرسالہ پڑھنے سے پہلے ہم کچھ بھی نہ تھے اور بے قیمت اور جانور جیسی زندگی گذار رہے تھے اور دنیوی مقصد کے سوا کوئی اور مقصد ہی نہ تھا۔ لیکن الرسالہ کے بعد ایسی تبدیلی آئی کہ اب ہم آخرت کے لئے فکرمند رہتے ہیں، اور آپ کے طرز کی زندگی گذارنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بس آپ سے التجا ہے کہ تہجد کے وقت رات کو جب آپ اٹھیں تو ہمارے لئے دعا کریں کہ اللہ ہمیں ثابت قدم رکھے اور عمل کی توفیق دے، آمین۔ (زاہد علی، عبد المنان، معشوق علی اور خیر محمد، پاکستان)

ایجنسی الرسالہ

الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔ الرسالہ (اردو) کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لئے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچہ ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ یا دو تین ماہ بعد اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زر تعاون الرسالہ

ہندستان کے لئے	بیرونی ممالک کے لئے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال Rs. 110	ایک سال	$ 20/ £10	$ 10/ £5
دو سال Rs. 200	دو سال	$ 35/ £18	$ 18/ £8
تین سال Rs. 300	تین سال	$ 50/ £25	$ 25/ £12
پانچ سال Rs. 480	پانچ سال	$ 80/ £40	$ 40/ £18

ISLAMIC BOOKS

Books by Maulana Wahiduddin Khan

Islam and Peace	Rs. 150.00
Principles of Islam	145.00
The Quran for All Humanity	75.00
Indian Muslims	65.00
God Arises	125.00
Islam: The Voice of Human Nature	40.00
Islam: Creator of the Modern Age	55.00
Woman Between Islam and Western Society	145.00
Woman in Islamic Shari'ah	80.00
Islam As It Is	70.00
An Islamic Treasury of Virtues	195.00
Religion and Science	45.00
Man Know Thyself	8.00
Muhammad: The Ideal Character	8.00
Tabligh Movement	40.00
Polygamy and Islam	7.00
Hijab in Islam	20.00
Concerning Divorce	7.00
The Way to Find God	25.00
The Teachings of Islam	50.00
The Good Life	45.00
The Garden of Paradise	45.00
The Fire of Hell	45.00
Islam and the Modern Man	25.00
Uniform Civil Code	10.00
Muhammad: A Prophet for All Humanity	195.00
A Treasury of the Qur'an	75.00
Words of the Prophet Muhammad	75.00
Qur'an: An Abiding Wonder	145.00
The Call of the Qur'an	95.00
The Moral Vision	145.00
Introducing Islam	195.00

The Qur'an Tr. T.B. Irving	Rs. 295.00
The Koran Tr. M.H. Shakir	195.00
Heart of the Koran by Lex Hixon	195.00
The Moral Values of the Quran by Harun Yahya	125.00
The Basic Concepts in the Quran by Harun Yahya	—
The Essential Arabic by Rafi'el-Imad Faynan	200.00
Presenting the Qur'an by Saniyasnain Khan	125.00
The Wonderful Universe of Allah by Saniyasnain Khan	85.00
The Soul of the Qur'an by Saniyasnain Khan	145.00
Tell Me About Hajj by Saniyasnain Khan	295.00
The Muslim Prayer Encyclopaedia Ruqaiyyah Waris Maqsood	325.00
After Death, Life! Ruqaiyyah Waris Maqsood	195.00
Living Islam Ruqaiyyah Waris Maqsood	295.00
A Basic Dictionary of Islam Ruqaiyyah Waris Maqsood	295.00
The Muslim Marriage Guide Ruqaiyyah Waris Maqsood	250.00
The Beautiful Commands of Allah Ruqaiyyah Waris Maqsood	125.00
The Beautiful Promises of Allah Ruqaiyyah Waris Maqsood	175.00
Muhammad: A Mercy to all the Nations by Q. A. Jairazbhoy	250.00
A-Z Steps to Leadership by Abdul Ghani Ahmed Barrie	95.00
The Sayings of Muhammad by Sir Abdullah Suhrwardy	75.00
The Life of the Prophet Muhammad by Mohd. Marmaduke Pickthall	75.00

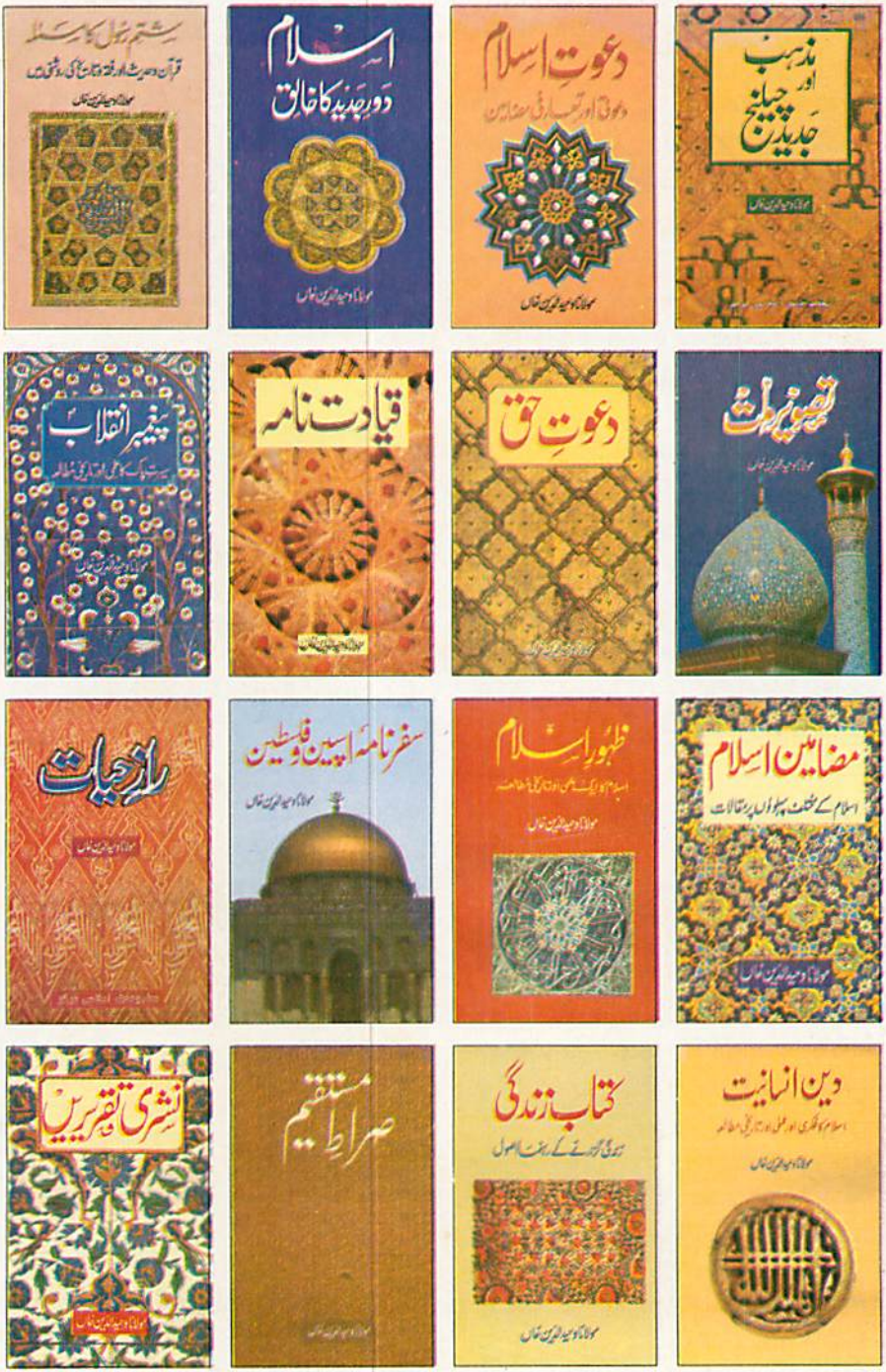

RNI 28822/76 • U(SE) 12/2000
Delhi Postal Regd. No. DL/11154/2000

Al-Risāla